ناول
بیلہ
آغا گل

(ناول)

آغا گل

کتاب .... بیلہ

مصنف .... آغا گل

موضوع .... ناول

پہلی اشاعت 2003ء

دوسری اشاعت 2019ء

قیمت 400روپے

زیر اہتمام:

مہر در

انسٹی ٹیوٹ آف ریسرچ اینڈ پبلی کیشن، کوئٹہ

mehirdar@gmail.com

081-245350 5

0333-7832323

مصور اپنے رنگ خود بناتا ہے، فنکار اپنی زبان خود وضع کرتا ہے۔ ٹیوبوں کے درآمدی رنگوں سے تصویریں نہیں بنتیں، ارباب اقتدار کی عطا کردہ زبان میں لکھا نہیں جاسکتا۔ اظہار کی طاقت سینے میں ہی گھٹ کے رہ جاتی ہے۔

Every thing can change but not the language that we carry inside us.

ہمیں اپنی زبان سے محبت نہیں ہے۔ نہ ہی زبان کے بارے میں ہم سنجیدہ ہیں۔ ہم بہت سی زبانوں کے گرداب میں گھوم رہے ہیں۔ ہماری اپنی کوئی بھی زبان نہیں ہے! دوچار سو برس میں شائد ہماری بھی کوئی زبان بن جائے۔ زبانیں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے حکم سے نہیں بنتیں۔ سماجی زندگی از خود زبان ڈھالتی چلی جاتی ہے۔

بیسویں صدی اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ تخلیق کائنات سے اب تک کوڑھ کی بیماری صرف جسموں تک ہی محدود رہا کرتی تھی۔ جبکہ بیسویں صدی میں ذہن کا کوڑھ وباء کی طرح نمودار ہوا۔ اور نوعِ انسان میں پھیلتا چلا گیا۔

بیسویں صدی میں دو عالمی جنگیں اور ایک سو پچھتر بڑی جنگیں لڑی گئیں۔ انسان کی بے توقیری بڑھی۔ مشینوں کی قدر و قیمت میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ اس صدی نے نثر کا وقار بڑھایا۔ ورنہ تو دنیا شاعری کے زیر اثر ہی چلی آ رہی تھی، رزمیہ داستانوں حتیٰ کہ مذہبی کتابوں کا انداز بھی منظوم اور شاعرانہ ہی رہا۔ مگر بیسویں صدی کے بالکل آخر میں نثر بھی وڈیو اور گلیمر کے ہاتھوں مات کھا گئی۔ کتابیں اب بیل گاڑیوں کی طرح قصہء پارینہ بنتی جا رہی ہیں۔ خدشہ ہے کہ اگلے سو پچاس برس میں کتابیں دم توڑ جائیں گی فراعنہ کے مردہ جسموں کی طرح عجائب گھروں میں ہی رکھی دکھائی دیں گی۔

کتاب سے دوری کے باعث ادب سے بیگانگی کے سبب ذہن انسانی قنوطیت (Depression)' بے چینی (Anxiety) ' ذہنی دباؤ (Stress) اور عدم تحفظ (Insecurity) کی آماجگاہ بن چکا ہے۔ یہ کوئی بیماریاں نہیں ہیں، انسانی رویئے ہیں، جو ادب سے دوری کے باعث پیدا ہوئے۔

نسل انسانی اگر انسان بن کے ہی جینے پہ مصر ہے۔ جو بظاہر اتنا ضروری بھی نہیں ہے کہ تو اسے ادب کی جانب مراجعت کرنا ہوگی۔ ورنہ تو اپنے آباؤ اجداد کی طرح درختوں پہ کودتی پھاندتی، ٹہنیوں سے الٹا لٹکتی ہی دکھائی دے گی۔

کوئٹہ

18- اگست 2002ء

آغا گل

کتاب کی دستیابی

علم و ادب

پبلشر اینڈ بک سیلر

بک مال، تھرڈ فلور، دکان نمبر 311

اردو بازار، کراچی

رابطہ: 0335-262064

فکشن ہاؤس

بک اسٹریٹ

68 مزنگ روڈ، لاہور

فون: 042-36307550

حیدرآباد: 022-2780608

سیلز اینڈ سروسز

کبیر بلڈنگ، جناح روڈ، کوئٹہ

فون: +92-81-2843229

فیکس: +92-81-2837672

یونیورسٹی بک پوائنٹ

شاپ نمبر 10، کمپلیکس

بلوچستان یونیورسٹی، کوئٹہ

رابطہ: 0336- 8813838

کلرپکس انٹرپرائز

104، زرغون مارکیٹ

بالمقابل سول ہسپتال، جناح روڈ، کوئٹہ

فون: 0334-3838131

سمیر بک شاپ

بالمقابل بلوچستان یونیورسٹی

سبزل روڈ، کوئٹہ

فون: 0345-8310883

بہت سے سال بیتے، بہتیرے موسم آئے گئے۔ رحمان کوئٹہ کراچی کے درمیان کوچ چلاتا رہا۔ سڑک پہ نظریں جمائے انجن پہ دھیان دیئے، وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر رہتا۔ بعض اوقات بستر میں بھی آنکھوں کے آگے سڑک دوڑتی چلی جاتی۔ جب ندیوں میں پانی ہوتا اور سیلابی ریلے سڑکوں کو ادھیڑ کے رکھ دیتے یا جب آگ میں لپٹی ہواؤں سے سنگریزے جہنم کا منظر پیش کرنے لگتے اور جب لکپاس برف سے بند ہو جاتا۔ مختلف موسمی حالات میں وہ کوچ لیے بڑھتا ہی چلا جاتا۔ اس نے کبھی توجہ نہ دی آس پاس دنیا کیا کر رہی ہے۔ انسان بھی اس کے لیے بس مسافر ہی تھے۔ بظاہر تو یوں لگتا گویا رحمان کی زندگی کا مقصد ہی کوچ چلانا تھا۔ کوئٹہ کراچی کے درمیان کوچ دوڑاتے ہوئے زندگی کے ان گنت

سال گزر گئے۔ سیٹھ شمروز اس سے بہت خوش تھا۔ وہ رحمان کو ہر سال نیا کوچ دلوا دیا کرتا۔ جانے کتنے ہی کوچ آئے اور گئے۔ رحمان اس لائن کا ہیرو تھا۔ سٹیئرنگ پر کنٹرول تھا۔ سڑکوں کا مزاج آشنا تھا۔ بریک کا استعمال جانتا تھا۔ خود سر' خود پسند' ضدی اس قدر کہ دوسرے کوچوں کے پہلو بہ پہلو آ کر اشارہ کرتا' مخالف ڈرائیور کو ''آؤ' مقابلہ کرو''۔ اس مقابلے میں دوسری کمپنیوں کے کئی ایک کوچز تباہ ہوگئے۔ اُلٹ گئے' پھسل کر پتھروں پہ جا چڑھے۔ نتیجتاً تمام کمپنیوں نے ڈرائیوروں کو سختی سے منع کر رکھا تھا کہ رحمان چاہے جس قدر بھی اکسائے' کبھی بھی رحمان سے تیز رفتاری کا مقابلہ نہ کیا جائے۔ رحمان کوچ بھی ہمیشہ سہ پہر میں لے کر نکلتا تھا' اور منہ اندھیرے کراچی جا پہنچتا۔ کوچ گیتوں سے بھرا رہتا۔ کچھ مسافر سوئے رہتے۔ کچھ آپس میں گپ شپ کرتے۔ کچھ تسبیح کے دانے گھماتے رہتے۔ غرضیکہ کوچ میں ایک دنیا آباد رہتی۔ کراچی پہنچ کر دن بھر آرام کرتا اور سہ پہر میں کوچ لے کر کوئٹہ روانہ ہو جاتا۔ وہی گہما گہمی' وہی مسکراتے' ہنستے' روتے' بسورتے چہرے' بچوں کی کلکاریاں' نوجوانوں کے قہقہے' خوبصورت عورتیں کے جسموں کی گولائیاں' جیسے تسبیح کے دانے۔ اسے اکثر گمان گزرتا' کہ لاشعوری طور پر مرد' دانے نہیں جسموں کی گولائیاں گھما رہے ہیں۔ بڑے بڑے گنبد دیکھ کر بھی اسے ایسا ہی خیال آیا کرتا۔ وہی صبحِ کاذب کا تقدس بھرا چہرہ۔ اسے ہر سفر ایک نیا سفر لگتا۔ اور پھر کوئٹہ سے روانہ ہوتا تو بہت ہی اچھا لگتا۔ کوئٹہ سے نکلے تو لک پاس' اترے تو پڑنگ آباد' مستونگ' چوتو'

کھڈکوچہ، منگوچر، کوہنگ، سوراب اور قلات۔ جہاں وہ کوچ روک دیتا۔ ہوٹل والے ہاتھوں ہاتھ لیتے۔''رحمان استاد کے لیے چائے، ڈبل اے ون دودھ پتی'' نعرہ لگتا۔ عام ڈرائیوروں کے لیے بھی لائن کے ہوٹل فری تھے۔ قلات سے نکلے تو پیر لیٹو کا مزار جس کے معتقد ہندو بھی تھے، اور پھر پہنچے، سوراب، زہری کراس۔ پھر انجیرہ اور لاکھوریاں اور باغبانہ۔ خضدار کے ہوٹل جہاں کھانا بہت اچھا ملتا ہے۔ دم لے کے نکلے تو کلی اسماعیل کی روشنیاں، کوشک ندی کا حسن، میر عمر پکنک سپاٹ کی دل آویزی۔ سردار عطا اللہ مینگل کا علاقہ وڈھ، لک باران کے موڑ۔ نمانی اور بیلا پھر ویارو۔ جس کے بعد کوسٹ گارڈ کی تباہ کن چیک پوسٹ، اذیت ناک سلوک، توہین آمیز رویہ۔ کوسٹ گارڈ سے بچے تو اوتھل اور اورماڑہ کراس جو خالی رہتا ہے۔ پھر ویندر، میانی، گڈانی کراس۔ جو ویران پڑا رہتا۔ چک نواز چورنگی جس کے بعد حب کا علاقہ شروع ہو جاتا۔ حب ندی پر بلوچستان کا علاقہ ختم ہوتا، سامنے کراچی۔ رحمان کراچی میں داخل ہوتا۔

رحمان سب سے بڑی کوچ کمپنی کے مالک سیٹھ شمروز کا لاڈلا تھا۔ سبھی جانتے تھے کہ اگر استاد رحمان چاہے تو کوئی بھی کوچ اُن کے ہوٹل پہ نہ رُکنے پائے۔ اس لیے وہ عام کوچ ڈرائیوروں کو وی آئی پی کا درجہ دیتے تو استاد رحمان کو وی وی آئی پی کا۔ سبھی رحمان کے آگے بچھے چلے جاتے۔

یہ استادی بھی بس مقدر کی بات تھی۔ تقدیر ہی کھینچ لائی۔ بلوچستان میں جدوجہد اور حقوق کے لیے جب تحریک چلی تو اس کے والد اور چچا بھی

تحریک میں شامل ہو گئے۔ پکڑ دھکڑ اور تھرڈ ڈگری سے بچنے کے لیے پہاڑوں پہ جا پناہ لی اور نوجوانوں کے ساتھ مل کر گوریلا جدوجہد شروع کردی۔ مختلف جگہوں پہ انہوں نے Surprise Attack کیے' Ambush کیے۔ ایسی ہی کسی خونیں جھڑپ میں وہ بلوچستان پر قربان ہو گئے۔ مگر گمنام شہیدوں کی طرح۔ دو ماہ تک علم ہی نہ ہوسکا' کہ وہ کہاں چلے گئے۔ ماں نے ایک ایک کرکے سارے زیور بیچ ڈالے جو دلہن بننے پہ اسے پہنائے گئے تھے۔ اس نویلی دلہن نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ آٹے کے بدلے میں سارے گہنے پاتے فروخت کرنے پڑیں گے۔ ہمایوں بادشاہ نے ان کے گھرانے کو جو اشرفیاں بھجوائی تھیں ان میں میں صرف ایک ہی بچی تھی۔ اگر براہوی ہمایوں کی مدد نہ کرتے تو بلوچستان کے صحراؤں میں ہی مر جاتا۔ مغلوں نے یہ احسان ہمیشہ یاد رکھا۔ لیکن وہ احسان ماننے والے بادشاہ مٹ چکے تھے۔ اب وردیوں والے کرائے کے قاتل تھے جو کسی کا احسان نہیں مانتے۔ Do or Die والے لوگ جو گولی کی زبان میں بات کرتے ہیں۔

بھوک فوجی حکومت کی طرح ان کے گھر پہ مسلط ہو چکی تھی۔ جس سے چھٹکارہ پانے کا کوئی طریقہ کوئی وسیلہ نہیں تھا۔ اور ایک دن جب کھانے کو کچھ بھی نہ تھا۔ دوپہر میں بھوک شدید ہو گئی۔ رحمان تو بھوکا مر ہی جاتا مگر ماں اور دادی کے لیے وہ دکان پہ گیا اور تین کلو آٹا مانگا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ ملیشیاء کے بوسیدہ کپڑوں میں سہما سہما سا لگ رہا تھا۔ تین کلو آٹا تلا تو

لینے کے لیے کچھ نہ تھا۔ اس نے جھولی پھیلا دی۔ آٹا جھولی میں لے کر اسے بہت سکون ملا کہ اب ماں اور دادی روٹی کھالیں گی۔ دوبارہ گفتگو کرنے لگیں گی۔ رحمان مڑا گھر جانے کے لیے تو دکاندار نے للکارا ''پیسے کہاں ہیں؟''

رحمان کے چہرے پہ موت اتر آئی۔آنکھیں بے نور ہو گئیں۔ ''بابا آئے گا تو پیسے دے گا۔'' اس نے بے بسی سے التجا کی۔

''بیٹا! بابا تو تمہارا چاکررند ہے۔ رُستم ہے۔ نودبندغ ہے۔ پہاڑوں پر لڑ رہا ہے۔ ہمیں تو کاروبار چلانا ہے۔ پہلا ادھار چکاؤ تو پھر آٹا لے جانا۔ شاباش بیٹا شاباش۔'' اس نے ملازم کو اشارہ کیا کہ رحمان کی جھولی سے آٹا دوبارہ بوری میں گرا دے۔ رحمان حیران تھا گھر میں تو بھوک ہی بھوک ہے۔ جا کے کیا منہ دکھائے۔ گھر خالی ہاتھ کیسے جائے۔ گھر میں بھوک کا ڈیرا تھا۔ بھوکی آنکھیں چوکھٹ پہ گڑی اس کی راہ تک رہی تھیں۔ وہ ہراساں اور سہا سہا کھڑا تھا۔شمروز دور سے یہ سب کچھ دیکھتا چلا آرہا تھا۔ وہیں سے للکارا۔

''او بنیئے کے بچے! کتنا ادھار ہے تمہارا؟''

دکاندار نے رقم بتائی تو شمروز نے نوٹ سامنے پھینک دیئے۔''یہ لے اپنا ادھار اور باقی رقم اس بچے کے حساب میں جمع کرلے۔ یہ میرا بیٹا ہے۔ خبردار اگر اسے سامان نہ دیا تو تمہارے اس سڑے ہوئے کھوکھے کو آگ لگا دوں گا۔''

دکاندار کھسیانی ہنسی ہنستا نوٹ گننے لگا اور کھاتے میں اندراج بھی

کرلیا۔ دکاندار نے ہمدردی سے کہا،''بیٹا کئی ماہ سے صرف آٹا ہی کھا رہے ہو، یہ گھی، چینی، پتی اور دالیں بھی لیتے جاؤ۔''

دکاندار جلد سے جلد شمروز کی رقم برابر کر دینا چاہتا تھا۔ دکان کا ملازم سامان اٹھائے اٹھائے ساتھ گیا تو دادی نے لینے سے انکار کر دیا۔

''ہم خیرات لینے والے لوگ نہیں ہیں، سامان واپس کردو۔ شمروز کا شکریہ ادا کر دینا۔ اللہ اُسے اور بھی دے۔''

شمروز کی انگلیوں میں جلتا ہوا سگریٹ تھا جسے اس نے دادی سے چھپا لیا۔ وہ ہچکچاتا ہوا دروازے پہ آیا اور دادی کو یقین دلایا کہ یہ کوئی امدادی رقم نہیں ہے بلکہ اس نے رحمان کو کوچ پہ ملازمت دے دی ہے۔ یہ تو پیشگی تنخواہ کی رقم ہے۔ کئی ماہ بعد پھر انہوں نے ڈھنگ سے کھانا کھایا۔ ورنہ تو آٹے کی روٹیاں پانی سے نگلتے زندگی گزر رہی تھی۔

رحمان اگلے ہی روز شمروز کے ساتھ کوئٹہ چلا آیا۔ ماں اور دادی کے آنسو وہ کبھی نہ بھول پایا۔ ماں نے اسے دعائیں دی تھیں اور وعدہ لیا تھا کہ وہ شمروز سے کبھی جھوٹ نہیں بولے گا، کبھی دھوکہ نہیں دے گا، ہمیشہ حق کا ساتھ دے گا۔ چاہے اس کے لیے جان ہی دینا پڑے۔ دادی نے شمروز سے وعدہ لیا کہ وہ رحمان کی حفاظت کرے گا، ہمیشہ اس کا خیال رکھے گا۔

''یہ ایک براہوی کا وعدہ ہے۔'' شمروز نے سینے پہ ہاتھ رکھ کر قسم اٹھائی ''میرے جیتے جی رحمان کو کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ میں زبان دیتا ہو

کہ اوپر اللہ زمین پہ میں اس کی حفاظت کروں گا۔"

شمروز تو چاہتا تھا کہ رحمان کو اسکول میں تعلیم دلائی جائے مگر دادی کو اول تو یہ اعتراض تھا کہ وہ امداد کیوں لے۔ دوسرا یہ کہ تعلیم حاصل کرکے بھی اسے لاٹھی گولی کی سرکار کی ملازمت اختیار کرنا ہوگی۔ کسی آمر کے لیے اپنے ہی لوگوں پہ ظلم و ستم روا رکھنا ہوگا۔ ظلم کو اللہ کبھی معاف نہیں کرتا۔ کافروں کی حکومت تو رہ سکتی ہے بے انصاف اور ظالم حکومت کا انجام جہنم ہے۔ ایسی افسری سے محنت مزدوری ہی بہتر ہے۔ کیونکہ مزدوری سے دل مردہ نہیں ہوتا۔ ضمیر سے تعفن نہیں اٹھتا۔ یہاں بہت سے کوچ تھے۔ پورا کوئٹہ ہی ایک بڑا سا کوچ اڈہ لگ رہا تھا۔ شمروز کا محض ایک ہی کوچ تھا۔ لیکن چند ہی برس میں درجن بھر کوچ ہو گئے۔ شمروز پہ ہن برس رہا تھا۔ پھر تین درجن کوچ ہو گئے اتنے برسوں میں رحمان کلیز سے ترقی کرتا ہوا سیکنڈ ڈرائیور اور پھر ڈرائیور بن گیا۔ نہایت ہی کمسن ڈرائیور تھا۔ شمروز نے وقت سے پہلے ہی اسے ڈرائیونگ لائسنس بھی بنوا دیا۔

ڈرائیونگ کا کام اسے بہت اچھا لگتا۔ عید کے دنوں میں جب ڈرائیور کام کے لیے دوگنی تنخواہ پہ بھی رضامند نہ ہوتے رحمان بخوشی ڈبل ڈیوٹی کرتا۔ کوئٹہ سے کراچی کوچ پہنچا کر محض چند گھنٹے سوتا۔ اور سہ پہر میں دوبارہ کوچ لے کر کوئٹہ کے لیے روانہ ہو جاتا۔ ڈرائیور کہتے رحمان فولادی ہے، پتھر کا بنا ہوا ہے۔ تھکنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ گھر میں اس کا تھا ہی کون؟ ماں آنسو بہاتے

بہاتے شوہر اور دیور کا دُکھ سینے سے لگائے دنیا سے چلی گئی۔ فجر کی نماز میں دادی نے اتنا طویل سجدہ کیا کہ پھر نہ اُٹھی۔ مرتے دم اس کے چہرے پہ سکون تھا۔ چہرے پہ نور تھا۔

رحمان بینچہ کے علاقہ میں تھا کہ اسے دادی بے طرح یاد آنے لگی۔ اس نے سر جھٹکا۔ اسے یوں لگا گویا دادی اس کے پاس ہے۔خضدار پہ کوچ رُکا تو اسے سیٹھ شمروز کا پیغام ملا ''دادی فوت ہوگئی ہے' کوچ چھوڑ کر فوراً واپس آجاؤ۔'' رحمان کا دل ڈوب گیا۔ کتنی مضبوط تھی دادی۔ کیسی بے جگری سے مقابلہ کیا دکھوں کا' حالات کا' غربت کا اور کس سکون سے چل بسی ہے۔ وہ سر جھکائے خاموشی سے چائے پیتا چلا گیا۔ ہوٹل والے' ڈرائیور' کلینز اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اور تسلیاں دینے لگے رحمان نے سب سے بڑے تحمل اور صبر سے گفتگو کی۔ اتنے میں کراچی والا کوچ پہنچ گیا۔ وہ اپنا کوچ چھوڑ کر اس کوچ میں آبیٹھا۔ بس ڈرائیور بدلے۔ رحمان واپس کوئٹہ روانہ ہوگیا۔کلینر نے ٹیپ ریکارڈر بند کرنا چاہا تو رحمان نے منع کر دیا۔ ''مسافر خوش ہیں۔ انہیں خوش رہنے دو۔ جس طرح میں اپنا کوچ خود چلاتا ہوں' اپنے غم بھی خود ہی ڈرائیو کرتا ہوں۔''

رحمان نے سگریٹ سلگائی اور ونڈ سکرین سے باہر دیکھنے لگا۔ ان کا گھرانا کس قدر خوشحال تھا۔ لیکن حالات کیا صورت اختیار کرلی۔ خان قلات پر جب فوج کشی ہوئی تھی جو جن وفاداروں نے مستونگ سے قلات جانے والی سڑک پہ مورچہ بندی کر دی تھی اس میں رحمان کے بزرگ شامل تھے۔انہوں نے

بڑھ کر دعوتِ مبارزت دی۔ انہوں نے نواب نوروز خان کا ساتھ دیا تھا۔ انہوں نے برابر کے حقوق کا مطالبہ کیا تھا۔ ان کا اصرار تھا کہ بے شک انسان عقل میں، شکل و صورت میں علم و دانش میں برابر نہیں ہوتے۔ مگر ان کی ضرورتیں برابر ہوا کرتی ہیں۔ ایک چرواہے کو بھی اتنا ہی کھانا چاہیے پانی چاہیے جتنا کسی حکمران کو۔ لیکن وہ ایک بزدل انسان کی طرح بھاگ کر آرام دہ زندگی گزار رہا ہے۔ کوچ میں گیت ابلتے رہے، مسافر قہقہے لگاتے رہے۔ اور رحمان دل کا درد لیے زندگی کا کوچ سیدھا رکھنے کی کوششیں کرتا رہا۔

دادی کے بعد تو گھر میں تالہ ہی لگا رہتا اس ویران سے، دکھ بھرے گھر میں تو آنے کو جی بھی نہ چاہتا۔ ڈبل ڈیوٹی سے اچھی خاصی رقم ملتی۔ شمروز گاہے بگاہے تنخواہ کے علاوہ بھی روپیہ دیتا رہتا۔ اکاؤنٹ میں اچھا خاصہ سرمایہ جمع ہوتا رہا۔

کبھی کبھار وہ عید تہوار پہ گھر چلا آیا کرتا اور کوچ چلاتے ہوئے وہ ایک بار ضرور اپنے علاقے سے گزرتا تو اپنا اجڑا ہوا ویران یاد کرکے لمحہ بھر کے لیے گہری وادیوں کی طرح ویران اور بے روح ہو جایا کرتا۔ اسے یوں لگتا جیسے گھر کے مہلک ویرانے اسے آوازیں دینے لگتے ہوں۔ جیسے یادوں کے گھاؤ دل پہ لگتے ہوں۔ وہ وہ گھر جاتے ہوئے ڈرا کرتا۔ سارا ماضی گھر میں جیتا جاگتا کھڑا تھا۔ زنگ آلود کیواڑوں کے پیچھے کھڑا رحمان کے قدموں کی چاپ لیتا اور دوڑ کے گلے لگ جاتا۔ کئی ایک رشتہ داروں نے شادی کا مشورہ دیا بھی تو رحمان نے ہنسی میں بات ٹال دی۔ اس میں نئی محبتوں کی سکت نہ تھی۔

......❁......

عید کے دنوں میں وہ اچانک اُسے ملی، نہ گوری تھی نہ گندمی دونوں کا امتزاج تھا۔ پہلی نظر میں تو وہ ایک بہت خوبصورت من موہنی کلینز لگی۔ مگر بمپر آگے پیچھے کے پکار رہے تھے کہ لڑکی ہے۔ چہرے کی صباحت و ملاحت بھی لڑکیوں والی تھی۔ قد سوا پانچ فٹ رہا ہوگا۔ نہایت صحت مند، بوائے کٹ، مردانہ شلوار قمیض، مردانہ واسکٹ، بڑی انوکھی بڑی دلربا تھی۔ وہ لڑکی کیا تھی جیپ اور کار کا امتزاج تھا۔ وہ لڑکی مردانہ آن سے یوں بے باک سامنے آ کھڑی ہوئی کہ رحمان جھینپ سا گیا۔ ''لوگ آپ کو سلام کر رہے ہیں۔ شائد آپ بس کمپنی کے مالک ہیں۔''

رحمان لٹو ہوگیا کہ یہ لڑکی ہے یا لڑکا کیا دلربا چیز ہے جیسے فراری کار۔

"آپ کا کیا پرابلم ہے؟" وہ اس انہونی لڑکی کو دیکھ دیکھ پاگل ہو رہا۔ اللہ نے سارا حسن ایک ہی ماڈل کی لڑکی میں ڈال دیا تھا۔ لڑکی اسے گھائل ہوتا دیکھ کر فتح مندی سے مسکرائی "ہمیں جگہ نہیں مل رہی۔" اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حسن کا ناقابلِ برداشت کرنٹ مارا۔

رحمان ہنسا۔"کمال ہے کراچی سے پچھتر کے قریب کوچ کوئٹہ جاتے ہیں۔ آپ کو جگہ نہیں مل رہی۔ وہ سامنے جو کوچ ہے جس پہ لکھا ہے کنگ آف دی روڈ' بالکل نیا کوچ۔ اس میں بیٹھ جائیں' سیٹ نمبر دو اور تین پر۔ کسی اور کھٹارے میں نہ بیٹھ جانا۔ باقی سب دو نمبر کوچ ہیں۔" اتنے میں اس کے ابو پسینہ پونچھتے ہوئے آگئے۔ ان کے کندھے پہ بیگ تھا۔ چہرہ پہ دھول تھی۔

"ٹکٹ تو ملے ہیں' مگر تیئس اور چوبیس نمبر سیٹوں کے۔"

وہ کوئی پچپاس برس کا رہا ہوگا۔ چہرے پہ مسلسل پریشانی رہنے سے سلوٹیں ابھر آئیں تھیں' آنکھیں پرانے ٹائروں کی طرح میلی میلی سی لگ رہی تھیں۔

رحمان نے ان سے ٹکٹ لے لیے اور دوبارہ اپنا فقرہ دہرایا۔ "کوچ میں اے سی چل رہا ہے' آپ ائیرکنڈیشن میں بیٹھیں۔ سیٹ نمبر دو اور تین۔" ایسی صحت مند لڑکیوں کو عقب سے چلتے ہوئے دیکھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ جیسے دو Oval ٹائر ایک ہی رم پر چل رہے ہوں۔ جیسے دو کوہنگ ایک تنگ تھیلی میں جکڑ رکھے ہوں۔ لڑکی تمکنت سے مردانہ انداز میں چلتی ہوئی کوچ میں داخل

کوہنگ: تربوز

ہوگئی۔ منشی نے ٹکٹوں کے پیسے بھی بہ اصرار واپس کر دیئے۔ لڑکی نے حیرت سے دیکھا کہ سب کیا ہے۔

''استاد کے مہمانوں سے کمپنی کرایہ نہیں لیتی۔''

''تمہارا استاد ہے کیا بلا؟'' لڑکی محظوظ ہوئی۔ پانچ سو کا نوٹ اس نے دوبارہ پرس میں رکھ لیا۔

''استاد کنگ آف دی روڈ ہے۔'' خدو نے فوراً جواب دیا۔رحمان نے اشارہ کیا۔ کلینر نے ان دونوں کا سامان رکھ دیا' انہیں سیٹوں پہ بٹھا کر مؤدب ہوگیا۔ ''اور کوئی حکم؟''

''بس جلدی سے کوچ چلا دو''

کلینر کا نام خدا بخش تھا۔ سبھی اسے خدو کہتے تھے۔ اس نے گیلنوں کا پانی پی رکھا تھا۔ عمر تو بیس بائیس برس رہی ہوگی، مگر تجربہ ہزار برس کا تھا۔ اس نے جو زندگی میں پہلی بار رحمان کے دل کا انجن اسٹارٹ ہوتے دیکھا اس کی آنکھوں میں محبت کا چوبیس وولٹ بیٹری والا نور دیکھا تو جھٹ سے کولڈ ڈرنک لے آیا۔ دونوں کو پیش کی۔ بتیسی باہر تھی۔ لہٰذا انہیں کولڈ ڈرنک لیتے ہی بن پڑی۔ یہ مہمان نوازی لڑکی کے لیے حیران کن تھی۔

لڑکی خاصی محتاط تھی۔اس نے خدو سے پوچھا ''کوئی ہمیں اٹھائے گا تو نہیں؟'' وہ سخت عدم تحفظ کا شکار تھی' شائد باپ کو بھی وہی سنبھالے ہوئے تھی۔

خدو قہقہے بکھیرتا پھر رہا تھا۔ ''میں جو ہوں۔ دیکھ لوں گا۔''

''ذرا پاس پاس ہی رہنا۔'' لڑکی میں اعتماد کی کمی تھی۔وہ ڈری ڈری سی بدستور سیٹ کو غیر محفوظ سمجھ رہی تھی۔ اتنے میں دو اور تین نمبر سیٹ کے مسافر آگئے اور خدو سے الجھ پڑے۔''یہ تو ہماری سیٹیں ہیں۔''

خدو نے سر پیش کر دیا۔''سر حاضر ہے' آپ ڈنڈے مار لیں' غلطی ہوگئی۔منشی نے عید کے رش کی وجہ سے ڈبل بکنگ کر دی ہے۔ آپ دوسرے کوچ میں آجائیے۔ چلیں میں بٹھا دوں۔ صاب آپ ناراض نہ ہوں میں آپ کا خادم ہوں' سارے کوچ آپ کے ہیں۔''

وہ سب کچھ سنتی رہی' اور لاتعلق رہی۔ چپ چاپ سپ لیتی رہی۔ اتنے میں رحمان نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ تیز رفتار ڈرائیور تو وہ تھا ہی۔ آج تو گاڑی اُڑی جا رہی تھی۔ حب کے بعد Diversions آئیں تو لڑکی نے مضبوطی سے رحمان کی سیٹ کا آہنی کونہ پکڑ لیا۔ کوچ پتھروں پہ تقریباً پھسلتا ہوا اُڑ رہا تھا۔ مہارت سے موڑ کاٹے جا رہے تھے۔ رحمان نے پٹو کندھے سے اتار کر ایک جانب رکھ دیا تھا۔ نگاہیں سامنے گڑی ہوئی تھیں۔ وہ زور سے چلائی۔ ''کیا آپ آہستہ نہیں چلا سکتے۔ ہمیں کوئٹہ جانا ہے' دوسری دنیا میں نہیں۔'' اس آواز میں ایک نامعلوم سی اپنائیت تھی' گلہ تھا' ایک حکم تھا' ایک خدشہ تھا۔

''کیا آپ کو صبح کوئٹہ نہیں پہنچنا؟'' رحمان نے خوش دلی سے جواب دیا۔ ''کیا عید کی نماز منگوچر میں ادا کریں گے۔'' رحمان چابکدستی سے گیئر بدل

رہا تھا۔

خدو گیئر کے ڈھکن پہ آ بیٹھا۔ اور اس کی دلجوئی کرنے لگا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔''

بولا، ''یہ رحمان استاد ہے' گولی کی طرح گاڑی چلاتا ہے۔ لائن کا سب سے تیز رفتار ڈرائیور ہے۔ جو کوچ ایک گھنٹہ پہلے نکلے تھے یہ انہیں وڈھ کے قریب پکڑ لے گا۔ دیکھ لینا۔ آئندہ صرف ہماری کمپنی میں سفر کرنا باقی سب کھٹارے ہیں۔''

لڑکی بڑی تنک مزاج تھی۔ ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''زندہ بچی تو ضرور سفر کروں گی۔ استاد آپ کیا آگ بجھانے جا رہے ہیں۔''

خدو نے جھٹ کیسٹ لگا دیا۔ رحمان بہت دنوں بعد کھلکھلا کر ہنس دیا۔

کتنا حسیں ہے موسم
کتنا حسیں سفر ہے
ساتھی ہے خوبصورت
یہ موسم کو بھی خبر ہے گیت فضا کو مزید رومانی بنا رہے تھے۔

آخر اس لڑکا نما لڑکی میں ایسا کیا ہے' رحمان نے خوشی سے سوچا۔ یہ کیوں مجھے اچھی لگ رہی ہے۔ شائد تو اِن دن ہے۔ ورنہ ایسی خاص بات کیا ہے۔ ایسی ہیڈ لائیٹ' ایسا فریم' ایسے بمپر تو ہر لڑکی کے ہوتے ہیں۔ وہ

تو کوچ میں بھانت بھانت کی گفتگو سنا کرتا تھا۔ کسی نے کہا تھا کہ انسان مر کے دوبارہ جنم لیتا ہے۔

جیسے کوچ کراچی سے دوبارہ ڈینٹنگ پینٹنگ' اوورہالنگ کر کے کوئٹہ آجائے۔ انسان بھی رنگ روپ' صورت' زبان بدل کے دوبارہ پیدا ہو جاتا ہے۔ تو کیا یہ میرے پچھلے جنم کی ساتھی ہے۔ ایسے دل کو کیوں کھینچ رہی ہے۔ پتھر اُڑتے رہے' کوچ دوڑتا رہا۔ غبار کا ایک بادل کوچ کے عقب میں چلا آرہا تھا۔ قصبے گزرتے رہے۔ اسے یوں لگا گویا وہ شاہ مرید ہے' اس کے اونٹ کے پیچھے حانی بیٹھی ہے۔ وہ حانی کو لیے جا رہا ہے' یا وہ توکلی مست ہے' اور سمو کو ساتھ دور لیے جا رہا ہے' ہزاروں کلومیٹر دور، بہت کوہلو سے دور' بارکھان سے بہت دور! مگر کوچ تو صبحِ کاذب کے وقت مستونگ سے میان غنڈی پہنچ جائے گا۔ اور شہر کی جانب نشیب میں اترنے لگے گا۔ پھر سامنے کوئٹہ ہوگا' جو اس لڑکی کو سموچا نگل جائے گا۔ کوئٹہ کسی آدم خور مگرمچھ کی طرح. انسانوں کو نگل لیتا ہے۔ خدو نہایت رومانی کیسٹ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے لگاتا رہا۔

کوچ سڑک پہ سرپٹ دوڑا چلا جا رہا تھا جنگی گھوڑے کی طرح۔ دھرتی کا سینہ چیرتے ہوئے۔

خضدار کے ہوٹل پہ رات گئے کوچ رُکا تو رحمان نے انہیں کھانے کی دعوت دی۔ اس کے ابو ہچکچائے تو رحمان نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ''ان ہوٹلوں میں ہمارے مہمانوں کا کھانا فری ہوا کرتا ہے۔''

اس کے ابو کے پاس اور کوئی عذر نہ تھا' لب پہ تشکر تھا۔ ''آپ نے ہمارا کتنا خیال رکھا ہے۔ ہم آپ کے بے حد مشکور ہیں۔''

رحمان اور اس کے مہمانوں کو الگ کمرے میں بٹھایا گیا۔ ڈاکٹر سرور کمرے میں پہلے ہی سے موجود تھا۔ رحمان سے علیک سلیک ہوئی کھانا کھا چکا تھا اور اٹھ کر باہر جا رہا تھا۔ ڈاکٹر سرور کراچی میں پریکٹس کرتا تھا۔ جہاز میں اس لیے سفر نہ کرتا کہ پہلے تو کھڈ کوچہ سے کوئٹہ جانا پڑتا۔ اگلی صبح جہاز ملتا۔ بہت وقت ضائع ہوتا۔ ڈاکٹروں کا تو وقت ہی پیسہ ہے۔ لہٰذا وہ رات کو کوچ میں آبیٹھتا جب صبح کا تارا جھلملاتا تو وہ حب کی حدود میں داخل ہو جاتا۔ اس لیے وہ اپنے سٹیٹس سے قطع نظر کوچ میں سفر کو ترجیح دیا کرتا۔ بہت بے تکلف انسان تھا۔ بڑا ہنس مکھ تھا' اکثر لوگ نہیں جانتے تھے کہ وہ ایک کامیاب سرجن ہے۔ ان تباہ حال سڑکوں پہ وہ اپنی قیمتی کار لاتے ہوئے بھی ڈرتا تھا۔ اس کا قول تھا کہ کار کو بھی گرل فرینڈ کی طرح سنبھال سنبھال کر برتنا چاہیے اور کچے روٹ پر ہرگز نہیں چلانا چاہیے۔

سرور بلا تکلف رحمان کا بازو تھامے باہر چلا آیا۔ سرور کا کوچ کراچی کے لیے روانہ ہو رہا تھا۔ ڈرائیور ہارن بجا رہا تھا مسافروں کو متوجہ کرنے کے لیے۔ سرور بلا تمہید بولنے لگا۔ ''دیکھو رحمان بات یہ ہے کہ ڈاکٹروں سے تو کچھ چھپتا ہی نہیں ہے اور ڈاکٹر آنکھوں میں ایک دوائی ڈالتے ہیں بیلا ڈونا۔ جس سے آنکھ کی پتلی پھیل جاتی ہے۔ پہلے زمانے میں خواتین اپنی آنکھوں کو

خوبصورت بنانے کے لیے یہ دوائی ڈالا کرتی تھیں بیلا کا مطلب ہے' خوبصورت اور ڈونا کا مطلب ہے خاتون یعنی خوبصورت عورت۔ تمہاری آنکھوں میں پہلی بار بیلا ڈونا دیکھ رہا ہوں۔ یہ کیا اُسی بیلا ڈونا کا اثر ہے۔ وہ لڑکا نما لڑکی۔ تتلی جیسی جو اندر بیٹھی ہے' خوبصورت لڑکے اور پرکشش لڑکی کا ملا جلا شاہکار۔ پہلی بار تمہاری آنکھوں میں زندگی دیکھ رہا ہوں۔ استاد تمہارے تو دونوں شوق پورے ہوسکتے ہیں۔'' سرور نے قہقہہ لگاتے ہوئے رحمان کے کندھے پر دوستانہ ہاتھ مارا۔

''بہادر مرد نہ تو محبت چھپاتے ہیں نہ ہی نفرت۔ لیکن اکثر محاورے اور اقوالِ زریں بزدل مردوں نے بنائے ہیں۔ اس لیے گمان ہوتا ہے کہ بہادر ہی غلطی پہ ہیں۔ زنانہ مزاج حکمرانوں نے عوام کا مزاج بھی زنانہ بنا دیا محبت کا اظہار بھی یہاں گناہ ہے' محبت چھپانا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ لیکن رحمان تم تو بہادر ہو۔''

''واقعی ڈاکٹر! بچے تو کھلونوں سے کھیل کر جوان ہوتے ہیں۔ میں آنسوؤں اور دکھوں میں ڈوب کر نکلا آپ تو میرے حالات جانتے ہیں۔ لگتا ہے یہ میری گمشدہ محبت ہے۔ دل کو سائیڈ پر کھینچ رہی ہے۔ میرے اوریجنل کاغذ اور رجسٹریشن بک چھین لیے ہیں۔''

''تم اپنے دل کی وہیل الائمنٹ کرالینا۔ اور میڈیکل چیک اپ بھی کرا لینا کہ وہ لڑکی ہے یا لڑکا۔ مگر جو بھی ٹھیک ہی ہے۔''

ڈاکٹر سرور کا کوچ زور زور سے ہارن بجا رہا تھا۔

"چپ رہو" رحمان نے ڈرائیور کو اشارے سے ڈانٹا۔ جواباً ڈرائیور نے انکساری سے دانتوں کی نمائش کی۔

پورے روٹ پہ رحمان کا بہت احترام کیا جاتا تھا۔ جہاں کہیں کسی ڈرائیور کا جھگڑا ہوا، لفڑا ہو۔ وہاں رحمان لڑنے مرنے پہنچ جاتا تھا۔ ٹریفک پولیس سے جھگڑنا' کوسٹ گارڈ سے الجھنا، فرنٹیئر کانسٹیبلری سے بحث و تکرار کرنا اور لیویز سے ضد لگانا اس کا روز کا معمول تھا۔

سبھی جانتے تھے، ہر کمپنی کے ڈرائیور بخوبی آگاہ تھے کہ رحمان ہی ان کا سب سے بڑا سہارا ہے۔ اس لیے روٹ کے ڈرائیور اس کا بہت ادب کرتے، ڈرائیور نے ہارن بجانا بند کر دیا اور سرور کی راہ دیکھنے لگا۔

"ڈاکٹر صاحب! جانے اس لڑکی میں کیا ہے واقعی بس دل کو کھینچتی ہے۔ لگتا ہے دل کا وہیل بیلنس ہی آوٹ ہوگیا ہے۔"

ڈاکٹر نے خلوص دل سے مشورہ دیا "اسے آوٹ ہی رہنے دو۔ یہ تمہاری محبت والی شکل ہی اچھی لگتی ہے۔ تمہارا تو چہرہ ہی بدل گیا ہے۔ آنکھوں میں زندگی لوٹ آئی ہے۔ God is Love اور دیکھو یہ دل کا معاملہ ہے۔ اس دنیا میں فائدہ اور نقصان نہیں دیکھا جاتا۔ یہ محبت ہے' کوچ نہیں' تمہیں محبت کا خالی کوچ ہی چلانا ہوگا۔ اچھا خدا حافظ! کبھی کراچی آنا ہسپتال۔ مگر زخمی ہو کر نہیں۔"

ڈاکٹر سرور کا کوچ زناٹے سے کسی حملہ آور کی مانند کراچی کی جانب بڑھا۔ جہاں مرطوب ہواؤں کا راج ہے۔ جہاں لاکھوں انسان ہیں' ہزاروں کوچ ہیں۔ جہاں ہر شے بے وقعت ہے۔ جہاں زندگی سستی ہے۔ انسان بے وقعت ہے۔

بیلا ڈونا کھانا کھا چکی تھی' اور چائے پی رہی تھی۔ بڑے مردانہ انداز میں بیٹھی ہوئی تھی۔ یوں تن کے جیسے جان ہی نکال دے گی۔

''بہت دیر لگا دی؟ کہاں تھے؟''

کتنا تحکم تھا' کتنی دلچسپی تھی۔ کتنی اپنائیت تھی۔ یہ فقرہ یوں کب کسی نے کہا تھا۔ کسی زمانے میں ماں کہا کرتی تھی اور پھر دادی۔ اب تو زندگی کا اکیلا پن تھا۔ تنہائی تھی۔ اب تو گھر میں تالے پڑے رہتے ہیں' جو رفتہ رفتہ زنگ آلود اور سخت ہو گئے ہیں۔ یا شائد نہیں چاہتے کہ رحمان انہیں کھولے۔ بہت روٹھے روٹھے سے تالے۔ اپنے اپنے سے تالے۔

''یہ مشہور ڈاکٹر سرور ہیں میرے دوست ہیں ان سے گپ شپ تھی۔''

بیلا ڈونا بہت متاثر تھی ''یہ تو بہت بڑے سرجن ہیں آپ کے دوست ہیں۔''

''ہاں! میرے تو بہت سے ڈاکٹر دوست ہیں۔''

''میں ڈاکٹر بن رہی ہوں۔ میڈیکل پڑھتی ہوں۔ آپ میری سفارش کیا کریں گے۔ پاس ہونے کے لیے۔''

"ہاں کیوں نہیں۔ مجھے آپ بتا دیا کریں میرے اور بھی بہت سے ڈاکٹر دوست ہیں۔" رحمان کو خوشی ہوئی کہ وہ اس قافلہ کے کام آ سکتا ہے۔

بیلا ڈونا اک بار پھر ساتھ آ بیٹھی اپنی سیٹ پہ۔ رحمان نے سوچا کمپنی کو چاہیے' ایک سیٹ ڈرائیور کے ساتھ اور بھی لگا دیا کرے' سیٹھ شمروز سے فرمائش کرنی پڑے گی۔ کاش کوئٹہ کی سڑک ہزاروں کلومیٹر طویل ہو جائے۔

رحمان اپنے آپ سے گفتگو کرتا رہا۔ کوچ بڑھتا چلا گیا' یہ لڑکا نما لڑکی کیسی آگ لگا رہی ہے۔ یہ لڑکی بھی تو ایک طوفان ہے۔ جلوۂ طور جیسا کوچ پہ چمکتے چاند جیسا۔ دل کے میٹر میں H کی جانب جھکاؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ دل سلگ سا رہا ہے۔ بیلا کے جسم کے زاویئے اس کے دل کا ریڈی ایٹر Choke کر چکے تھے۔ جلن ہی جلن تھی۔ حدت ہی حدت تھی۔ آگ ہی آگ تھی۔

بیلا ڈونا نے اسے چیونگم دی۔ انگلیوں سے انگلیاں مس ہوئیں۔ جسم نے جسم چھوا۔ آگ کو آگ لگی۔ رحمان نے چیونگم تھام کر ہاتھ بہت آہستگی سے واپس ہٹایا۔ رحمان نے آدھی چیونگم دانتوں سے کاٹ کر زبان پہ رکھ لی اور آدھی جیب میں رکھی۔

بیلا ڈونا بہت متعجب ہوئی۔

"پوری کیوں نہیں کھائی' میرے پاس اور بھی ہیں۔"

"یونہی بس' میرے پاس رہے گی۔ آپ کی نشانی۔"

کوچ کا بائیاں پہیہ لہرا کر سڑک کے کچے کنارے میں اتر گیا۔ اور جھول کھاتا ہوا دوبارہ سڑک پہ آ گیا سڑک کے Soft Shoulder سے گرد اٹھی۔ رحمان کو سخت ندامت ہوئی۔ اس نے پوری توجہ سڑک پہ مبذول کر دی۔

کوئٹہ شہر صبح کی گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ سارے مسافر اترتے چلے گئے۔ بیلا ڈونا نے رحمان کو اپنا پتہ بتایا۔ لکھ کے بھی دیا۔ اس کے والد نے بہ اصرار رحمان کو مدعو کیا۔ بیلہ کا انگ انگ الگ بول رہا تھا۔ جیسے ہر حصہ باغی ہو۔ ہر حصہ اسے پکار رہا ہو۔

بیلہ اپنے ابو کے ساتھ رکشے میں بیٹھ کر چلی گئی۔

''کرایہ مت لینا استاد کے مہمان ہیں۔''

خدو نے پھرتی سے پچاس روپے کا نوٹ رکشہ ڈرائیور کی جیب میں اُڑس دیا۔

رحمان عجیب تذبذب کے عالم میں تھا۔ بیلہ ایک سٹوڈنٹ تھی میڈیکل کی۔ اسے ڈاکٹر بننا تھا۔ عورتوں کی سپیشلسٹ بننا تھا۔ اور رحمان اس سے پندرہ برس بڑا تھا۔ ڈرائیور تھا کسی کا۔ رحمان واجبی سا پڑھنا لکھنا جانتا تھا۔ بالکل ہی غیر اہم تھا۔

یہ کیسا میل ہوگا۔ جیسے کوچ کو رکشے کا انجن لگا دیا جائے۔ صرف اچھا لگنا تو کوئی بات نہیں۔ اسے تو بیلہ سے عشق ہوا جاتا تھا۔ ورنہ تو رانی مکرجی ایشا پٹیل اور ایشوریا رائے بھی اسے پسند تھیں۔ مگر کوئی بھی اس کے لیے اس

کی ڈرائیونگ کے لیے خطرناک نہ تھی۔ اور اس لڑکی نے تو محبت کا گیدان نصب کر دیا تھا۔

رحمان چپ چاپ چینکی ہوٹل میں جا بیٹھا۔

کوئلوں پہ چینکیں دھری تھیں۔ پانی ابل رہا تھا' فضا میں دھویں اور چائے کی پتی کی ملی جلی خوشبو تھی۔ کوئٹہ دھیرے دھیرے جاگ رہا تھا۔ کوہِ مردار کے عقب میں سورج کروٹیں بدل رہا تھا۔

''میرے باپ نے کیسے سینے پہ گولیاں کھائی ہوں گی۔ کیسے وہ پیاسے پہاڑوں پہ گرا ہوگا' کیسے اس نے بلوچستان کے پہاڑوں کو ایک اور شہید کا خون پلایا ہوگا۔ شہیدوں کا خون چاٹنے والے پہاڑ کتنے پائیرہ ہو چکے ہیں۔ اور چچا' جانے کہاں جان کی قربانی دے گیا۔

حقوق کی خاطر۔ مظلوم لوگوں کی خاطر۔ بیلا ڈونا کا میرا ساتھ نبھ نہیں سکتا۔ وہ مجھے ایک ڈرائیور ہی سمجھتی رہے گی۔ ہیرو کا بیٹا ایک لڑکی سے شکست نہیں کھا سکتا۔ وہ تو کوچ دوڑاتا ہے تو یوں لگتا ہے کہ اپنے دشمنوں کو کچلنے جا رہا ہے' باپ اور چچا کو بچانے جا رہا ہو۔ جانے انہیں گولیاں کہاں کہاں لگی ہوں گی۔ جانے انہوں نے کب کب رحمان کو پکارا ہوگا۔ شاید وہ آخری بار سینے سے لگا لینا چاہتے ہوں' کچھ کہنا چاہتے ہوں۔

محبت خطرناک چیز ہے' انسان کو بزدل بنا دیتی ہے۔ جسم کا ساتھ تو

گیدان: خیمہ

ٹھیک ہے مگر محبت خطرناک ہے۔ اور بیلہ سے تو محبت ہوئی جاتی ہے۔ "مجھے بیلہ کا پتہ ہی جلا دینا چاہیے۔ نہ نمبر پلیٹ ہوگی نہ گاڑی ملے گی۔" رحمان نے فیصلہ کرلیا۔

رحمان نے واسکٹ کی جیب سے کاغذ نکالا اور اٹھ کر ابلتی چینکوں کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اس نے کاغذ آخری بار کھولا' بیلا ڈونا کی تحریر کو دیکھا۔ اس کی خوشبو کو دل میں اتارا' کاغذ پہ انگلیوں کے لمس کو چھوا اور کاغذ دہکتے انگاروں پہ رکھ دیا' ایک شعلہ کپکپایا' اور کاغذ کسی سیاہ ٹنڈل میں تبدیل ہوگیا۔

اور اسی شام وہ کوچ لے کر کراچی نکل گیا "آج تو تمہارا ریسٹ ہے" سیٹھ شمروز نے پدرانہ شفقت سے یاد دلایا۔

"جی نہیں! مجھے جانا ہے" اس نے نظریں ملائے بغیر ہی جواب دیا۔

خدو نے رحمان کی آنکھوں کی بیٹری ڈاؤن دیکھی تو سمجھ گیا کہ رحمان ایک بہت بڑا فیصلہ کرچکا ہے۔ زندگی میں ایک ہی خوشی آئی تھی' گرین سگنل جلا ہی تھا کہ بس خوشی یوں گزر گئی جیسے پیر لیٹو کے مزار کے نشیب سے کوچ گزر جاتا ہے۔ خدو کو بہت دکھ ہوا۔ مگر وہ دکھوں کو سگریٹ کے دھویں کے ساتھ دل میں اتارتے چلے جانے کا عادی تھا۔

رحمان دوبارہ اپنی دُھن میں کوچ چلاتا ہوا کراچی سے پلٹا تو دفتر میں اسے ایک بند لفافہ دیا گیا۔

لفافے پر تحریر بیلا ڈونا کی تھی۔ یہ وہی تحریر تھی جس نے اسے اپنا پتہ

لکھ کے دیا تھا۔ محض اتنا لکھا تھا۔ ''رحمان ڈرائیور۔'' رحمان لفافہ دیکھتا ہی چلا گیا۔

رحمان کے دل کے Tapped آواز کرنے لگے' دل کا آر پی ایم خطرناک حد تک بڑھ گیا۔ کرینک دیوانہ وار گھومنے لگی اور بریک فیل ہو گئے۔

وہ لفافہ تھامے دفتر سے باہر نکل آیا' باہر گہما گہمی تھی۔ اتنے بہت سے کوچ' اتنے بہت سے لوگ۔ مگر وہ کس قدر اکیلا تھا۔ اور اس کا اپنا ویران گھر تھا۔ زنگ آلود تالوں والا۔ جہاں سارا دن غم زدہ ہوائیں چیخا کرتیں' آوازیں دیا کرتیں' گھر کے مکینوں کو جو کسی انجانے کوچ میں سوار ہو کر موت کے موٹر وے پہ نکل گئے تھے۔ جہاں No U Turn کا دائمی بورڈ ایستادہ ہے۔

رحمان نے ہمت سے کام لے کر لفافہ چاک کیا اور خط نکالا' صرف اتنی ہی تحریر تھی:

''ہم آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' ایک حکم ایک التجا ایک محبت ایک یاد دہانی اور کوہِ کیرتھر کے ویرانوں میں رحمان اکیلا رہ گیا۔

جھالاوان کے بے رحم طوفان اس کے گرد بھیروں ناچنے لگے۔ خط کے اندر ہی نام وہ پتہ بھی تحریر تھا۔

اس شام وہ بیلا ڈونا کے گھر پہنچا۔ سیٹھ شمروز کی بہت سی گاڑیوں میں سے وہ من چاہی کار اٹھالیا کرتا تھا۔ یہ چمکتی دمکتی لینڈ کروزنگ بالکل نئی تھی۔ گاڑی میں باہر خدو بیٹھا رہا۔ اور رحمان اس کی والدہ اور والد کے ہمراہ چائے

پیتا رہا۔ بیلا ڈونا کی اتنی بہت سی بہنیں تھیں۔ اور سبھی مشکور تھیں کہ وہ اتنی دیکھ بھال کرتے ہوئے بیلہ اور ان کے ابو کو لایا۔اتنا ہمدرد اور مخلص انسان ہے۔

جانے کیسے پھر سب اِدھر اُدھر ہو گئے۔ وہ دونوں کمرے میں اکیلے رہ گئے رحمان کا دل دھڑکنے لگا۔

''آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے؟''

''ایسے ہی دل چاہتا ہے آپ سے ملنے کو۔''

''آپ لڑکا لڑکا سا کیوں لگتی ہیں۔''

''میں لڑکا لڑکا سا بننا چاہتی ہوں۔ ہمارا کوئی بھائی نہیں۔ بچپن سے ہی میں نے والدین کا بیٹا بننے کی کوشش کی، بہنوں کا بھائی بننے کی کوشش کی۔''

رحمان نے سادگی سے تبصرہ کیا ''مگر ویسے تو آپ لڑکی ہیں ناں۔''

بیلہ دھیرے سے ہنس دی ''آج کی تاریخ تک تو لڑکی ہی ہوں کبھی لڑکا بنی تو اطلاع دے دوں گی۔ آپ کو کیا اچھا لگتا ہے۔''

''آپ ہی اچھی لگتی ہیں۔'' رحمان نے ہمت سے کام لیا۔

''میں نے آپ کا نام بیلا ڈونا رکھا ہے۔''

رحمان شکست تسلیم کر چکا تھا۔ فتح و شکست تو مردوں کا مقدر ہے۔ ہار ماننے میں کیا حرج ہے۔ وہ لڑتا ہوا ہارا ہے۔ وہ بھی اپنے ہاتھ سے اپنے ہی دل سے جو سخت باغی ہے۔

''صرف بیلہ کیوں نہیں۔ بیلہ تو موتیا کا پھول ہے، جو ہی ہے دریا

کنارے کا جنگل ہے۔''

''میں نے سوچا ہی نہیں ورنہ تو بیلہ زیادہ آسان ہے۔'' یہ لڑکی دریا کنارے کا جنگل ہے جس میں راستہ ہی کھو بیٹھا ہوں۔ رحمان نے سوچا۔

پھر بیلہ نے اسے اپنی پوری کہانی سنا ڈالی کہ کس مصیبت سے اسے داخلہ ملا ہے۔ کتنے اذیت کے دن وہ گزار رہی ہے۔ دشواریاں ہی دشواریاں۔ والد کس مالی بحران سے گزر رہے ہیں۔ کالج میں ہسپتال میں بھی اسے تنگ کیا جاتا ہے' سکون نام کی کوئی شے زندگی میں نہیں۔ موسم بھی بہت مختلف ہے' سخت گرمی۔ مچھر اور اذیت ناک نمی۔ نمکین سمندری ہوائیں۔ بیلہ کچھ اور بے تکلف ہوگئی۔ رحمان کو پا کر اس کا دل بھر آیا تھا۔

''کبھی کبھی تو جی چاہتا ہے چیخ چیخ کر رونے لگوں' سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر واپس چلی آؤں۔ مگر سوچتی ہوں کہ خاندان کا کیا بنے گا۔ مجھے ڈاکٹر بن کے سب کو سنبھالنا ہے۔''

رحمان کو یوں لگا جیسے بیلہ نہ بول رہی ہو اس کا اپنا دل بول رہا ہو۔ وہ بھی کرب سے زندگی بھر گزرتا رہا۔ کربناک روٹ کبھی ختم ہی نہ ہوا۔

''مچھر یا گرمی تو کوئی خاص بات نہیں۔ میں آپ کے کمرے میں ایئرکنڈیشن لگا دوں گا۔ جو کوئی تنگ کرتا ہے۔ مجھے دکھا دیں' ٹانگیں توڑ کر لیاری میں پھینک دیں گے پھر وہ آپ کو کسی فٹ پاتھ پہ خیرات مانگتا نظر آئے گا۔''

بیلہ گلابی ہوگئی۔ بریک لائیٹ سے چہرہ گلرنگ ہوگیا۔

''بچپن سے دل چاہتا تھا کوئی مجھے تحفظ دے میرا خیال رکھے۔''

رحمان کا دل چاہا اٹھ کے بیلہ کا ہاتھ تھام لے اور اسے کہہ دے کہ وہ بھی اکیلا ہے' گاؤں لے جا کر اپنا ویران گھر دکھائے جہاں ماتم کناں ہواؤں کا گیراج ہے۔ دکھوں کا بس اڈا ہے۔ اسے اپنا بنا کر گھر بسا لے۔ خوشی پر کچھ حق تو اس کا بھی ہے۔

مگر وہ ضبط کر گیا اور بدستور مسکراتا ہوا چائے پیتا رہا۔ جو بیلہ کی طرح میٹھی تھی۔ بیلہ کی نگاہوں سے بھی وہ کچھ میٹھی میٹھی پیتا رہا۔

پھر بیلہ گھر کے اندر گئی' ایک کاغذ اور کچھ روپے اٹھا لائی۔

''یہ ایک میڈیکل کی کتاب ہے' کراچی سے آپ لادیں گے؟''

رحمان نے بیلہ کی تحریر والا کاغذ واسکٹ کی جیب میں پڑھے بغیر ہی رکھ لیا اور روپے لینے سے انکار کر دیا۔ ''میں اتنا بھی گیا گزرا نہیں کہ ایک کتاب نہ خرید سکوں۔ میں اتنا غریب نہیں جتنا دکھائی دیتا ہوں۔''

''یہ اچھا نہیں لگتا۔ ورنہ تو میں آپ کی باہر کھڑی گاڑی دیکھ چکی ہوں' آپ اتنے امیر ہیں تو کوچ کیوں چلاتے ہیں۔''

رحمان مسکرایا ''میں صرف دل کا امیر ہوں۔ زندہ رہنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے' آپ بھی تو ڈاکٹر بن رہی ہیں۔ بس کمپنی سیٹھ شمروز کی ہے۔ میں تو اس کا ایک ڈرائیور ہوں بس۔''

''ڈاکٹر بننا میرا جہاد ہے' میرے والد چند سال میں ریٹائر ہو جائیں

گے۔ سارے خاندان کی ذمہ داری مجھے نبھانا ہوگی۔ گیس کے بلز' بجلی کے بل' بہنوں کی تعلیم پھر ان کی شادیاں۔ والدین کا علاج۔'' بیلہ نے کچھ بھی نہ چھپانا چاہا۔

دل نہ چاہتے ہوئے بھی رحمان نے اجازت لی' بیلہ کے ابو اور امی کھانے کے لیے اصرار کرتے رہے' مگر وہ معذرت طلب کرکے چلا آیا۔

خدو بہت خوش تھا۔ بیلہ نے اسے بھی پرتکلف چائے بھجوائی تھی۔ خدو کو اصل خوشی تو یہ تھی کہ رحمان کی زندگی میں بہار آ گئی ہے۔ خدو خود بھی زمانے کا ستایا ہوا' ٹکر ٹکر انسان تھا۔لیکن زندگی کا مقابلہ کیے جا رہا تھا۔

رحمان نے فون کرکے کراچی سے کتاب منگوالی۔ سبزی منڈی کا منشی اس کے نادر شاہی حکم پہ بھاگم بھاگ کتاب خرید لایا' اور صبح کے کوچ ڈرائیور کو کتاب دے دی کہ فوراً رحمان کو پہنچا دے۔

رحمان کو اگلے ہی روز جانا اچھا نہ لگا۔ روایت پسند انسان تھا۔ اس نے کتاب خدو کے ہاتھ بھجوائی۔خدو منہ لٹکائے واپس آ گیا۔

''استاد! بیلہ نے کتاب نہیں لی۔ واپس کردی ہے۔ کہتی ہے تم کیوں لائے ہو؟ استاد! میرا تو ہر جگہ منہ کالا ہے۔کوئی قبول نہیں کرتا۔''

''کتاب کی تو بیلہ کو ضرورت تھی۔ پھر کتاب کیوں نہیں لی۔ پڑھے گی کیسے؟'' اس نے سیٹھ شمروز کی لینڈ کروزینگ سٹارٹ کی۔ گن مین زبردستی گاڑی

ٹکر ٹکر: تباہ حال

سے اتارے اور چل دیا۔ خدو تو تربیت یافتہ کلینر تھا چھلانگ مار کے گاڑی میں آ ڈھیر ہوا۔ گن مین چیختے ہی رہ گئے۔ ''کوئی سیٹھ شمروز سمجھ کر گولی مار دے گا۔ ہمیں تو ساتھ لیتے جاؤ۔'' مگر رحمان نہ رکا ایسے ماہر ڈرائیور کی کون راہ روکتا۔

لینڈ کروزینگ بل کھاتی ہوئی ہجوم میں گم ہوگئی۔ کوچوں کے شور میں سب کچھ مدغم ہوگیا۔ ایک جھٹکے سے لینڈ کروز رکی اور رحمان باہر آیا۔ بیلہ کا دکھی چہرہ رحمان کو مجرم بنا گیا۔

رحمان' بیلہ کے سامنے کسی مجرم کی طرح بیٹھا تھا۔

''آپ ملنا نہیں چاہتے کیا؟''

رحمان خاموش رہا۔ بولے کہ نہ ہی بولے۔

گومگو کا عالم تھا۔

اور دیوار پہ لگی گھڑی کو دیکھتا رہا۔ جو ٹِک ٹِک کر کے چل رہی تھی۔

اس کا اپنا دل بھی ٹِک ٹِک کیے جا رہا تھا۔

زبان خاموش رہی۔ محبت کا اظہار کسی لڑکی سے کیسے کیا جاتا ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا۔ بیلہ نے کتاب میز سے اٹھا کے اسے تھما دی۔

''لے جائیے اپنی کتاب' نہیں چاہیے مجھے۔''

رحمان نے کتاب اٹھائی اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''رک جائیے'' بیلہ پریشان سی ہوگئی۔ رحمان کا چہرہ تاثرات سے عاری رہا۔

''آپ اتنے...... اتنے...... وہ کیوں ہیں۔''

''وہ کیا۔''

''اتنے برے! اتنے ظالم!''

''میں تو صرف آپ کی بات مانتا ہوں۔''

''آپ نہیں جانتے کہ میں آپ سے ملنا بھی چاہتی تھی۔ آپ نے خدو کو کیوں بھجوایا۔ مجھے ملنا تو آپ سے تھا۔ کوئی آپ کا بھی تو انتظار کرتا ہے۔''

''چاہتا تو میں بھی تھا' مگر روز روز آنا اچھا نہیں لگتا۔''

''یہ پرانے رواج بدل گئے ہیں' اب لوگ روز روز ملتے ہیں۔ آپ روز آیا کریں گے۔ آپ کب تک مستونگی بنے رہیں گے۔''

رحمان مشینی انداز میں بول پڑا۔ ''روز روز آؤں گا تو آپ کے والدین ناراض ہوں گے۔''

اسی لمحہ برتنوں کی کھنک بڑھتی چلی آئی۔ کپ ٹرے میں بج رہے تھے۔ یا انہیں بجایا جا رہا تھا۔ بیلہ کی امی چائے لیے آئی۔

وہ آخری فقرہ سن چکی تھی۔

اس نے شکوہ کیا۔ ''ہم تمہیں اپنا سمجھتے ہیں' تم غیروں والا برتاؤ کرتے ہو۔ تمہارا اپنا گھر ہے۔ جب دل چاہے آیا کرو۔ ضرور آیا کرو۔ بلکہ روز آیا کرو۔ اس شہر میں ہمارا تو کوئی بھی اپنا نہیں۔''

بیلہ کی امی نے چائے کپ میں انڈیل دی۔

''تم یہ اتنے مؤدب سے کیوں بیٹھے ہو؟ بے تکلف ہمیں اپنا سمجھ کے

بیٹھو، یہ تمہارا ہی گھر ہے۔''

اور پھر بہت سی باتیں ہوئیں، اس کی امی نے ساری داستان ہی سنا ڈالی۔ مگر یہ وہی کہانی تھی۔ اس کی اپنی۔ بس کردار بدل گئے تھے۔ ورنہ تو کچھ بھی نیا نہ تھا۔ وہی دکھ، وہی مجبوراں، وہی محرومیاں۔

رحمان نے بھی بتا دیا ہچکچاتے ہوئے کہ اس کا بھی کوئی اپنا نہیں، نہ ماں نہ باپ۔ بھائی بہن تو تھے ہی نہیں۔ رحمان نے محبت کا خانہ ہی زندگی سے نکال سکھا تھا۔ حتیٰ کہ وہ کوچ بھی ہر سال بدل لیتا ہے کہ کہیں کوچ ہی سے محبت نہ ہو جائے۔ رحمان نے بتایا کہ زندگی اسے کھٹارہ سی گاڑی لگتی ہے اور انسان بھانت بھانت کی گاڑیاں، چھوٹی بڑی نئی پرانی جیسے گاڑیوں کے جو بھی نام ہوں۔ جو بھی ساخت ہو ہوتی ساری ایک سی ہی ہوا کرتی ہیں۔ انسان بھی کوچ کی طرح غموں کے ٹائروں پہ چلتا ہے۔ مایوسی کا ڈیزل پیتا ہے۔ آس پاس کے لوگوں کا، خون کے رشتوں کا بوجھ اٹھائے تاریک بلوچستان کے ویراں دڑ دڑ پہ دوڑتا چلا جاتا ہے، ٹائر پھٹ جاتے ہیں، Rim نکل آتے ہیں، وہ چلتا ہی رہتا ہے۔ آخر موت کی وادی میں گم ہو جاتا ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ دوبارہ جنم لے کر اسی بے معنی اور بے مقصد سڑک پہ دوڑنے لگتا ہے۔ جہاں سنگریزے ہی سنگریزے ہیں۔ کبھی کوچ بن کر کبھی کار بن کر کبھی ٹرالر بن کر کبھی میونسپلٹی کا ٹرک بن کر کبھی دھواں اگلتا بھونکتا پھدکتا رکشہ بن کر۔ لیکن بیلہ نے اسے عورت سن متعارف کرایا اور زندگی کا احساس دلایا۔

دڑ دڑ: بجری والی سڑکیں

بیلہ کا گھر اس کا اپنا گھر تھا' میڈیکل کی باتیں۔ انسانی جسم کی باتیں۔ بیلہ کی باتوں سے لگتا کہ انسانی جسم صرف ہڈیوں اور ٹیوبوں کا ڈھیر ہے۔ اور رحمان رفتہ رفتہ خود بھی اچھا بھلا Quack بنتا چلا گیا۔ وہ کتابیں لایا کرتا۔ نامناسب حصوں کی کبھی ڈھانچوں کی تصویریں کبھی عجیب الم غلم۔ اب کی بار وہ بیلہ کو کراچی چھوڑنے گیا تو ساتھ کوئی نہ گیا۔بیلہ اکیلی اس کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔بڑا اچھا سفر کٹا' یوں پلک جھپکتے میں خضدار آیا تو رحمان کو دکھ ہونے لگا۔ خدو نے قریب آ کر دانتوں کی نمائش کی ''استاد! آج گاڑی کا انجن کمزور لگ رہا ہے۔ استاد رِنگ بیٹھ گئے ہیں کہ آٹومائیزر کام نہیں کر رہے۔''

محبت انسان کو کمزور بنا دیتی ہے۔

اور نفرت طاقتور۔

اور بیلہ ڈرائیونگ سیٹ کے پیچھے ایک نمبر سیٹ پہ بیٹھی تھی۔ دو نمبر سیٹ رحمان نے خالی رکھی تھی۔ وہ برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ کوئی بیلہ کے برابر بیٹھے۔ خضدار کے بعد بیلہ نے کالی مردانہ جیکٹ اتار کے اس کا تکیہ بنالیا اور کھڑکی سے ٹیک لگالی' اس کی آنکھیں بند ہوچکی تھیں۔ اور آبادیاں گزر رہی تھیں۔

اور زندگی خوبصورت تھی۔بیلا شہر گزرا' پھر وینڈر'پھر اوتھل اور سمندری ہوائیں کوچ سے لپٹنے لگیں' گڈانی چوک اور بھوتانی کی آبادیاں سو رہی تھیں' کہیں کہیں سڑک کے کنارے چائے کے ہوٹل نم زدہ زرد روشنیوں میں اونگھ

رہے تھے۔ کتے ادھر ادھر سوئے ہوئے تھے۔

پتھریلا علاقہ کب کا گزر چکا تھا۔ اب سمندری ریت ہی ریت پھیلی ہوئی تھی۔ سیٹھ شمروز نے ایک بار بتایا تھا کہ سکندرِاعظم کے حملے سے اب تک سمندر بلوچستان سے اسی کلومیٹر دور ہٹ چکا ہے' اگر اب تک سمندر ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ کراچی بھی نہ ہوتا۔ میڈیکل کالج اگر سمندر پہ ہی بننا تھا تو کلمت میں ہوتا' گوادر میں ہوتا' پسنی میں ہوتا اور ماڑہ میں ہوتا۔ لیکن بلوچستان کے سواحل تو اس کے دل کی طرح ویران پڑے تھے۔

کوچ حب کے سوئے ہوئے شہر میں سے گزر رہا تھا کہ بیلہ جاگ اٹھی۔ اس کی آنکھیں متوحش تھیں۔ شاید اس نے کوئی خواب دیکھا تھا۔ اپنے گھر کا' اپنے ماں باپ کا۔ کس محبت بھرے گھر سے وہ دکھوں کی نگری میں چلی آتی ہے۔ شاید اسے ماں کے ہاتھوں کا لمس یاد آ رہا تھا۔

رحمان کی زندگی میں اب ٹھہراؤ ایک تنظیم آ چکی تھی کوئٹہ آتا تو بیلہ کے ہاں چلا جایا کرتا۔ اس کی بہنوں کا خیال رکھتا۔ اس کے والدین کی ضروریات پوری کرتا۔ اور کراچی میں وہ بیلہ کے ہاسٹل چلا جایا کرتا۔ ان کے ہاں فون نہیں تھا۔ رحمان ہی بیلہ کا سارا حال احوال دیا کرتا۔ اسے بہت مزہ آتا۔ خاموش اور ویران سی زندگی میں اِدھر بھی انتظار ہوا کرتا اُدھر بھی۔ رحمان نے فون گھر پہ لگوانا چاہا۔ مگر بیلہ کے والد راضی نہ ہوئے۔

ایک بار جب بیلہ کا خط پڑھ کے اس کے ابو کا چہرہ کملایا تو رحمان

نے خط اُچک لیا۔

"کیا بات ہے خیر تو ہے آپ پریشان کیوں ہو گئے۔"

"بیلہ نے کچھ رقم مانگی ہے۔" ابو کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

"میں دے آؤں گا!" رحمان نے لاپرواہی سے کہا۔

ابو کی جان میں جان آئی۔ وہ پرسکون سا ہوگیا۔

"میں لکھ لوں گا۔ یہ رقم تمہیں واپس کردوں گا۔ مگر بیلہ کو علم نہ ہونے پائے کہ اس کے اخراجات رک سکتے ہیں۔ اور یہ قرض بھی راز ہی رہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" رحمان بڑا فراخدل تھا۔ کوچ لے کر نکلتے ہوئے اس نے رقم مانگی تو شمروز نے بغور دیکھا۔ شمروز کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

"تمہارے اخراجات بہت بڑھتے جا رہے ہیں۔ کیا وجہ ہے۔"

رحمان کو ناگوار گزرا "یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔" اس کی پیشانی پہ بل پڑ گئے۔ شمروز اس گستاخانہ انداز پہ اچھل پڑا۔

"تمہارا ہر معاملہ میرا ذاتی معاملہ ہے' ایسا تھپڑ ماروں گا کہ سارے دانت باہر نکل جائیں گے' پنکچر ٹائر کی طرح پھرو گے" شمروز کو لاڈ لگانے کا شوق رہتا۔ وہ رحمان کو اب تک چھوٹا بچہ سمجھ کر ڈانٹ دیا کرتا تھا۔ پھر خود ہی منا بھی لیا کرتا۔ رحمان بولے بغیر منہ بنائے باہر نکل گیا۔ شمروز کے سامنے زبان کھولنے کی جرأت کہاں تھی۔ شمروز ہی تو اس کا محسن تھا۔ اولاد کی طرح پالا پوسا تھا' ناز نخرے اٹھائے تھے۔ رحمان سٹارٹ کوچ میں آ بیٹھا۔

خدو کوچ سٹارٹ کر کے ہارن بجایا کرتا تھا۔ تاکہ سارے مسافر آ بیٹھیں۔ کوئی مسافر پہنچ نہ پاتا تو بغیر بکنگ کا مسافر بٹھا لیا جاتا۔ بکنگ والا پھر دوسرے کوچ میں بٹھا دیا جاتا۔ پریشر ہارن سے کاسی قبرستان کے مردے بھی ہڑبڑا اٹھتے۔

رحمان ڈبل روڈ سے سست روی سے نکلا۔ یہاں بڑا رش ہوا کرتا۔ سریاب کے اوورہیڈ برج سے بائیں جانب مڑا تو عقب سے ایک گاڑی نے بتیاں دکھائیں اور بڑھ کر کوچ کو رکنے کا اشارہ کیا۔ ساتھ ہی شمروز کا ایک ذاتی محافظ کار سے نکل دوڑا اور ڈرائیور کی جانب کا دروازہ کھول کے اوپر چڑھ آیا' اس سے پہلے کہ رحمان کوئی حرکت کرتا' اس نے نوٹ رحمان کی جیب میں ڈھونس دیئے ''بڑا غصے والا بنتا ہے۔ ابا۔ اتنا غصہ بھی ٹھیک نہیں۔ سیٹھ بولتا ہے غصہ مت کرو۔ اور چاہیے وہ کراچی والے منشی سے لے لینا۔''

شمروز کے محافظ بھی عصمت ملیشیاء کے کمانڈوز کی طرح برق رفتار تھے' یوں آئے' یوں غائب ہوگئے۔ رحمان کو اپنی بدتمیزی پہ ندامت سی محسوس ہوئی۔ جب قلات کے ہوٹل پہ چائے کے لیے رُکا تو اس نے دور پہاڑی پہ پیر لیٹو کے مزار کو دیکھ کر ادب سے دونوں ہاتھ اٹھائے دعا کی ''پیر لیٹو بیلہ مجھے دے دو۔ سر سے پاؤں تک پوری کی پوری' ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔'' اس مزار پہ ہندو بھی جاتے مسلمان بھی۔ رحمان کو بھی بڑی عقیدت تھی اس مزار سے۔ اسے یقین تھا کہ پیر لیٹو اسے بیلہ دلا دے گا۔

بیلہ رقم حاصل کر کے بہت خوش ہوئی۔ ''شکر ہے مجھے بہت ضرورت تھی''نوٹ اس نے جیب میں ڈال لیے۔

اس نے سفید اوورآل پہن رکھا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں سٹیتھو سکوپ تھا۔ اور ایک بڑا سا رجسٹر۔ ساتھ چلتے ہوئے وہ ڈاکٹرز کینٹین میں چلے آئے۔

''میں تمہارے لیے ایک گھڑی بھی لایا ہوں۔'' رحمان نے اس کی کلائی پہ گھڑی سجا دی۔

رحمان نے کسی ایرانی سمگلر سے خریدی تھی۔ بڑے ہی چاؤ سے لایا تھا۔

سفید گھڑی' سیاہ چمڑے کا سٹریپ۔

''تمہارے کوٹ کے ساتھ اچھا لگے گا۔''

''خوبصورت ہے!'' بیلہ خوش ہوئی۔

''یہ کمپنی دنیا کی سب سے مہنگی گھڑیاں بنانے والی پٹیک فیلپ ہے' یہ سفید لوہا نہیں وہائیٹ گولڈ ہے۔'' رحمان کے لہجے میں فخر تھا۔

''اوہ!'' بیلہ کی سانسیں رک گئیں ''تم میرے گھر دے دینا' یہاں ہاسٹل میں تو کوئی چرا لے گا۔''

''تمہارا دل بھی پھر تمہارے گھر کیوں نہ دے آؤں۔ اسے بھی تو خطرہ ہے اتنے چکنے چکنے سے ڈاکٹر تمہارے ساتھ پڑھتے ہیں۔''

''میرا دل تمہارے کوچ میں تمہارے ساتھ ساتھ ہی رہتا ہے۔''

''اچھا گھڑی پہن کے تو دکھا دو۔''

بیلہ نے گھڑی پہن لی۔ ''دیکھو کیسی لگتی ہے؟''

''اچھی ہے، تمہارے ہاتھ پہ خوبصورت ہوگئی ہے۔''

رحمان نے اچانک دماغ کلچ پکڑ لیا۔ دل کے وہیل فری ہو گئے۔

''بیلہ تم مجھ سے میرا مطلب ہے مجھ سے شادی کرو گی؟''

بیلہ چونک اٹھی۔ پھر سنبھل گئی۔ ''سوچیں گے' دیکھیں گے۔'' بیلہ نے سر جھٹکا۔ اتنی جلدی اتنا بڑا فیصلہ فی الحال کھانا تو کھاؤ۔ پہلے ڈاکٹر تو بننے دو۔ شادی بعد کی بات ہے۔''

''آسرا نہیں مجھے جواب چاہیے۔''

''یہ کوئی انجکشن نہیں کہ تمہیں لگا دوں۔ اور میں کہاں بھاگی جا رہی ہوں۔ تم اچانک خوفزدہ کیوں ہو جاتے ہو۔''

اس شام انہوں نے ساحل پہ لمبی سیر کی۔ مگر بیلہ کو احساس نہ ہوا کہ خدو دور دور رہ کر ان کی حفاظت کر رہا ہے۔

بیلہ نے گھڑی رحمان کو دے دی۔ ''یہ میری امی کو دے دینا۔'' اور ایک خط بھی دیا۔ ''یہ خط راستے میں پڑھنا۔ وڈھ کے بعد۔''

بیلہ کے مستقبل کی خاطر رحمان بیلہ سے صرف دو ڈھائی گھنٹے لیا کرتا تھا۔ پھر دل پہ جبر کرکے وہ چلا آیا کرتا۔ وہ نہیں چاہتا کہ بیلہ کی پڑھائی میں

حرج ہو۔

رات میں جب وڈھ کا علاقہ شروع ہوا تو اس نے ایک ہاتھ سے لفافہ چاک کیا۔ سفید کاغذ پہ انگریزی میں نیلی سیاہی سے خوش خط سی تحریر تھی اور ایک جانب لپ سٹک سے بنا ہونٹوں کا نشان تھا۔ ایک مکمل بوسہ! دو نمبر سیٹ پہ ڈاکٹر سرور تھا' رحمان نے اسے کاغذ تھما دیا۔ ''ڈاکٹر صاحب یہ کیا لکھا ہے؟''

سرور پڑھ کر پھڑک اٹھا۔

''واہ! کیا بات ہے' پہلے تمہارا نام ہے۔

Dear Rahman

I am Glad

You Love me

Beyond my expectaions

Bela

تمہاری بیلہ نے لکھا ہے پیارے رحمان تمہاری محبت میری توقعات سے زیادہ ہے۔'' استاد تمہاری حالت ٹھیک نہیں ہے۔ خضدار میں اپنا معائنہ کرانا۔ کیفیت بھی بتانا۔ اپنے معالج سے کچھ نیں چھپایا جاتا۔''

کوچ پتھر اُڑاتا' دھرتی پہ دوڑے جا رہا تھا۔ جیسے اندھیرے میں ایک پورا جہاں دوڑتا جا رہا ہو۔

خضدار میں وہ دونوں اکیلے کمرے میں آ بیٹھے‘ ویٹر نے کھانا لگا دیا۔

”دیکھو رحمان! محبت تو ٹھیک ہے‘ جیسے تم کوچ چلاتے ہو اگر اسے تم ہزار کلومیٹر پہ چلانے لگو یا تم ہائی روٹیشن پرمنٹ پہ لے جاؤ تو انجن تباہ ہو جائے گا۔ اسی طرح محبت کا ایکسلیٹر زیادہ ہو تو مرگی یا پاگل پن قسم کا مرض بن جاتا ہے۔ وہ محبت نہیں رہتی۔ ایک ذہنی بیماری بن جاتی ہے۔ تم اب مجنون بن چکے ہو۔ افسوس میں پہلے نہ مل سکا۔ ورنہ کنٹرول کر لیتا۔ تم بیلہ سے Obsessed ہو گئے ہو۔“

رحمان ٹھرا کے رہ گیا‘ لقمہ راستے میں ہی رہ گیا۔ واقعتاً ہی اسے ہر جانب بیلہ دکھائی دیا کرتی۔ ساتھ ساتھ رہا کرتی باتیں کرتی، لطیفے سنایا کرتی۔

پھر رحمان کو کوئی پریشانی نہ ہوئی۔ کسی خیال میں تو رہنا ہی ہوتا ہے۔ تو بیلہ کا خیال کیوں نہ ہو۔

”آپ مذاق کر رہے ہیں۔“

”ہاں میں اکثر مذاق کرتا ہوں۔ مگر قسمیہ طور پہ سچ کہتا ہوں کہ یہ لڑکی تمہیں تباہ کر دے گی۔ ایک بار ڈاکٹر بن لے پھر تمہیں پہچانے گی بھی نہیں۔ میں خود ڈاکٹر ہوں۔ میڈیکل کالج اور اٹیچ ہسپتال ان کا پولٹری فارم ہے۔یہاں وہ اپنا شوہر تلاش کرتی ہیں۔ ایک سپورٹنگ عاشق ساتھ رکھتی ہیں‘ جو اکثر ان سے عمر میں بڑا ہوتا ہے۔ یوں سمجھو کہ تم ایک سیڑھی ہو‘ جس کے ذریعے وہ کامیابی کی چھت پہ چڑھ جائے گی پھر تمہیں لات مار کر پھینک دے گی۔پہلے کسی

ڈاکٹر پہ ہاتھ مارے گی وہ نہ ملا تو کسی میڈیکل ریپ پر اتر آئے گی۔ ورنہ کوئی ٹھیکیدار قسم کا انسان۔ یا پھر شادی شدہ امیر مرد جسے پرانی بیوی سے کچھ ملتا نہ ہو۔"

باتیں تکلیف دہ تھیں رحمان نروس ہوگیا۔ "تو آپ کا کیا مشورہ ہے۔"

"یہی مشورہ کہ بریک لگا۔ عشق کو عشق سمجھ دیوانہ بننے کی کوششیں نہ کر استاد! تم نے کوچ پر بھی بیلہ لکھ لیا ہے۔ تمہاری زندگی بیلہ بن گئی ہے تم خود بھی بیلہ بن جاؤ گے۔ بیلہ کا چشمۂ فیض تو جاری ہے۔ جب یہ چشمۂ فیض بند ہوا بیلہ کا تب کا سوچو! کچھ تم ہی ہاتھ روکو استاد۔ ورنہ اس کے بغیر پاگل ہو جاؤ گے۔"

رحمان کو خود بھی محسوس ہوتا کہ وہ بیلہ میں ڈوب چکا ہے۔ پہلے وہ لائن کا ہیرو تھا۔ روڈ کنگ تھا' اب وہ محض ایک ڈرائیور بن کے رہ گیا ہے۔ جو ہمیشہ بیلہ کے ہی بارے میں سوچتا رہتا ہے۔ کبھی بیلہ کے پاس کبھی بیلہ کے گھر۔ وہ سب سے کٹتا جا رہا تھا۔ البتہ شمروز یہ سب کچھ برداشت کر رہا تھا کہ چلو رحمان کی تنہائی تو دور ہوئی۔ اس کے تعلقات قریبی لوگوں سے کشیدہ ہوئے جاتے تھے۔ پہلے تو وہ دوستوں کے ساتھ گپ شپ مارتا۔ نئے نئے لطیفے سنتا' سناتا' مسافروں پہ تبصرے کرتا۔ کسی چلبلی حسینہ پر' کسی نوبیاہتا پر کسی بہت موٹے مسافر پہ اور کسی طرحدار لونڈے پر فقرے کستا۔ اب اس کا بس اڈا بدل چکا تھا' بیلہ کا ہسپتال اور بیلہ کا گھر' وہ ان دو Stops کے درمیان ہی چلتا رہتا۔

پہلے تو آف ڈے میں وہ ڈرائیوروں کے ساتھ تاش کھیلا کرتا۔ کوئٹہ کی

مارکیٹوں کی سیر کرتا۔ کوئی خوبصورت چیز خرید لیتا۔ کبھی وردوشاہ مارکیٹ میں روسی' جرمن اور برطانوی Tool خریدنے چلا جایا کرتا۔ اس نے اپنے قریبی رشتہ داروں کو روسی ساخت کی زیر زمین پانی کھینچنے والی مشینیں خرید کر تحفتاً دی تھیں۔ جن کے ربڑ پائپ کنویں میں ڈال کر پانی کھینچا کرتے۔ بعض احباب پاس پڑوس کا پانی اسی پمپ سے چرا لیا کرتے۔ اور بہت خوش ہوتے۔ پڑوسی کو پتہ چلتا تو وہ ربڑ پائپ کاٹ کر سلسلہ منقطع کر دیتا اور بڑے قہقہے لگتے۔ عید کے موقعہ پر وہ کراچی کی ہول سیل مارکیٹ سے کپڑے کے تھان خریدتا اور گاؤں کے غریبوں میں جوڑے بانٹ دیا کرتا۔ قریبی رشتہ داروں کو مہنگے کپڑوں کے جوڑے دیا کرتا۔

شاید ایک وجہ یہ بھی رہی ہو کہ اس کا اپنا کوئی نہیں تھا۔ وہ آس پاس کے لوگوں سے روسی پمپ کے ذریعے محبت کشید کرنا چاہتا ہو۔ مگر اب تو بیلہ مل گئی تھی۔ اتنی چاہتوں بھری ساتھی' جو کبھی اس کے دل کے کوچ سے اترنا نہیں چاہتی تھی۔ جس نے زندگی بھر کے لیے اس کے دل کے کوچ کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال رکھی تھی۔

وہ دھیرے دھیرے دوستوں سے پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ جیسے باہر جانے والے کوچ آہستہ آہستہ چلتے رینگتے رینگتے ڈبل روڈ سے سریاب روڈ پہ نکل آتے ہیں' پھر فراٹے بھرتے ہوئے 'لکوئی' تھانہ سونا خان اور ہزار گنجی کی جانب دوڑ پڑتے ہیں۔ اسے بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ احباب کے ڈبل روڈ سے نکل

رہا ہے۔ مگر بیلہ نے کچھ یوں مسحور کر رکھا تھا کہ بیلہ کے سوا کچھ بھی دکھائی نہ دیتا۔ وہ محبت کی ہیڈ لائٹس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ جس کی چکاچوند میں آس پاس کی دنیا دکھائی ہی نہ دیتی۔

شمروز کو ایک بار رحمان نے قیمتی سگریٹ لائیٹر دیا تھا۔ جو رحمان کی تین ماہ کی تنخواہ کے مساوی تھا۔ شمروز نے اسے محبت بھری ڈانٹ بھی پلائی تھی' ''کچھ کل کے لیے بھی بچا کر رکھا کرو۔ زندگی ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی۔ اور روپیہ تو...... بے وفا عورتوں کی طرح یار بدلتا رہتا ہے۔'' رحمان کو ڈانٹ کر شمروز کو نرالی خوشی ہوا کرتی۔ لیکن اب وہ شمروز سے بھی دور دور رہتا۔ کھویا کھویا رہتا۔ رحمان یہ سارے تانے بانے بھی تو نہیں توڑ سکتا ہے۔ اس کی زندگی کا کوچ لکپاس کی تنگ گھاٹی میں چڑھائیاں چڑھ رہا تھا۔ جہاں آگے ہی آگے بڑھنے کا راستہ تو ہے' موڑنے' واپس جانے کا راستہ مسدود ہے' احمقانہ کوشش کی بھی تو ہزاروں فٹ نیچے آ گرے گا۔

بیلہ کی وجہ سے احباب سے تعلقات میں رحمان کی جانب سے سرد مہری اور قدرے کھچاؤ آنے لگا تھا ایک بار تو بہت بڑا فساد ہوتے ہوتے رہ گیا۔

ہوا یوں کہ رات کے ڈھائی تین بجے کوچ جب سمندری حدود میں دوڑا جا رہا تھا تو حسبِ معمول کوسٹ گارڈ کا چیک پوائنٹ آیا۔ جہاں سارے مسافروں کو اتار دیا جاتا۔ زن و مرد کی بھی تخصیص نہ تھی۔ بلوچستان میں خواتین

کا خاص احترام ہے۔ کوئی بلوچستانی تصور بھی نہیں کرسکتا کہ کسی خاتون کو رات کے دو بجے جگایا جائے اور اس کی تلاشی لی جائے، اس سے بات کی جائے۔ یہاں تک کہ باپ یا بھائی بھی رات کے وقت بہنوں بیٹیوں کے کمروں میں نہیں جاتے' کجا یہ کہ ان کی خواتین کو جگا کر رات کے دو بجے کوچ سے نکال باہر کیا جائے۔ بارہا جھگڑے بھی ہوا کرتے۔ رحمان لاتعلقی سے دیکھتا رہتا' سٹارٹ بس چھوڑ کر' ہینڈ بریک کھینچ کر وہ خود بھی باہر آ جایا کرتا' اسے بحث و مباحثہ دلچسپ سا لگتا۔

کوئی تعلیم یافتہ چیختا۔ ''تمہارا تو نام ہی کوسٹ گارڈ ہے' ساحلوں پہ جاؤ۔ یہاں بیلا اور اوتھل کے درمیان سڑکوں پہ بسیں کیوں روک رہے ہو؟ کمائی کر رہے ہو۔''

''ہم سمگلنگ کا سامان چیک کرتے ہیں۔''

''تو ملک کی سرحدوں پر جاؤ۔ ہم کوئٹہ' قلات اور خضدار سے آ رہے ہیں۔ بھارت اور اسرائیل سے نہیں۔''

''ہم سے کیوں لڑتے ہو؟''

''ہم لڑتے نہیں' جس روز لڑے تمہاری طبیعت صاف کر دیں گے۔''

مسافر دھمکیوں پر اتر آتے۔

کوئی دل جلا نعرہ لگاتا۔ ''بھائی سڑکوں پہ ہمیں اتارتے ہو۔ یہاں بچھو سانپ اور کنکھجورے پھرتے ہیں۔ خواتین اور بچے کہاں جائیں؟ نہ وہ گھنٹہ

بھر کھڑے رہ سکتے ہیں۔ نہ ہی ان اندھیروں میں میدانوں میں بیٹھ سکتے ہیں۔"

کوسٹ گارڈ سنی اَن سنی کر دیتے۔ زبردست کا ٹھینگا سر پہ۔ کون سنتا۔ درجن بھر کوچ ہمہ وقت کھڑے رہتے' تلاشیاں ہوا کرتیں' سوٹ کیس سفری بیگ کھلوائے جاتے۔ مسافروں کو اچھی طرح ذلیل کیا جاتا۔

امریکہ شریف نے باریش مسلمانوں کو خطرناک قرار دیا تھا لہٰذا ان کی تو خوب تلاشی ہوتی۔ ان کے شناختی کارڈ بھی طلب کیے جاتے۔ذرا سی بات پہ انہیں دھر لیا جاتا۔

شومیٔ تقدیر سے ایک بار کچھ نیا عملہ کوچ میں چڑھ آیا۔ اس نے بیلہ سے بھی اترنے کو کہا۔ رحمان نے نرمی سے انہیں منع کیا کہ یہ ہماری مہمان ہیں۔ ڈاکٹر ہیں۔ انہیں بیٹھا رہنے دو۔

لیکن عملہ رحمان کے لیے نیا تھا۔ وہ نہ مانے۔ "تم بیمار ہوتے ہو تو وقت لیتے ہؤ قطار بنا کر دوائی کا انتظار کرتے ہؤ اب یہ رویہ ہے تمہارا۔ انسان بنو۔" رحمان نے انہیں ڈپٹ دیا۔ وہ بھی ضد پہ اتر آئے۔

بات بڑھی تو بیلہ نے خود ہی اٹھنا چاہا۔ اس نے چاہا کہ سیٹ ہی چھوڑ دے۔ تاکہ بات نہ بڑھنے پائے۔ مگر رحمان نے سختی سے روک دیا۔

لوگوں کے سامنے وہ تکلف سے کام لیا کرتے تھے۔ "ڈاکٹر ساب! آپ بیٹھی رہیں میں ان سے سمجھ لوں گا۔"

کوسٹ گارڈ کا انچارج بولا "ڈاکٹر صاحب آپ باہر تشریف لے

آیے۔ تلاشی لینا ہمارا فرض ہے۔ ہماری ڈیوٹی ہے۔"

رحمان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ قریب تھا کہ وہ فولادی گھونسوں پہ اسے رکھ لیتا کہ رحمان کے تیور بھانپ کر وہ کوچ سے باہر کود پڑا "یہ ڈرائیور مجھے مارنا چاہتا ہے' پکڑو اسے۔"

وہ نام پکار پکار کے عملہ کو بلانے لگا۔ رحمان ایک جنگجو قوم سے تھا۔

رحمان پہ آبائی غصہ طاری ہو گیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ دوڑ کر ٹول بکس کھولا اور وہیل رینچ نکال لیا۔ قریب تھا کہ وہ ان کے چیتھڑے اتار دیتا۔ بدلتے ہوئے حالات کو دیکھ کر سٹاف بھاگ کھڑا ہوا' دیگر کوچز کے ڈرائیور بھی اتر آئے' مسافر تو پہلے ہی بدتمیز سٹاف کے خلاف تھے۔ جلے بھنے بیٹھے تھے' وہ بھی لڑنے کو پر تولنے لگے۔ چند اچکزئی بھی مسافروں میں شامل تھے۔ اچکزئیوں کا کسٹم سے زنجیر والوں سے لڑنے بھڑنے کا پرانا تجربہ ہے' انہوں نے مشورہ دیا کہ سٹاف پہ پتھراؤ کیا جائے۔ بلوچستان میں سنگسار کے لیے پتھروں کی کیا کمی ہے۔ مسافر Mob میں تبدیل ہو چکے تھے۔ انہوں نے جلدی جلدی پتھر اٹھا لیے۔ اچکزئیوں نے کندھوں سے پٹو اتار لیے اور پتھروں کا ذخیرہ کرنے لگے۔ کوئٹہ سے بدستور کوچ چلے آ رہے تھے' بلوائی بڑھتے جا رہے تھے۔ اتنے میں بیلہ باہر آ گئی۔

بوائے کٹ اور مردانہ لباس میں ملبوس اس حسین لڑکی کو مشتعل مجمع نظر انداز کر گیا۔ مگر جب وہ مجمع چیرتی ہوئی آگے بڑھی اور رحمان کے سامنے

آ کھڑی ہوئی تو سبھی حیران رہ گئے۔

اس لڑکی نے تحکمانہ انداز میں شہادت کی انگلی رحمان کے جانب بڑھائی اور کسی ظل الٰہی کی سی آن سے کہا۔ ''چلو گاڑی میں بیٹھو چلو یہاں سے۔ مت لڑو، یہ رینچ مجھے دے دو۔''

رحمان لال بھبھوکا بنا وہیل رینچ تھامے حملہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ چیکنگ سٹاف درجن بھر سے زیادہ نہ تھا وہ اپنی بیرک میں جا چھپا تھا۔سٹاف کو جان کے لالے پڑے تھے وردی پہن کر اپنے پرامن ہم وطنوں کو آنکھیں دکھانا اور بات ہے، بپھرے ہوئے ہجوم کا سامنا کرنا اور بات ہے۔ یہاں تو بات ہوتی ہی نہیں، لڑائی ہوتی ہے۔ اور لڑائی میں تو علم نہیں ہوتا کون کب مارا جائے گا۔ زندگی کے ستائے ہوئے لوگ مرنے کے لیے تیار ہی ہو چکے تھے۔

بیلہ کی مداخلت ڈرامائی تھی۔ سارا Mob دلچسپی سے یہ منظر دیکھنے لگا، چہروں کا کھچاؤ دور ہوگیا۔اچکزئی بھی مسکرانے لگے۔ پتھر انہوں زمین گرا دیئے۔

بیلہ نے محبت سے دباؤ ڈالا ''میں کہتی ہوں چلو، کوچ چلاؤ، مجھے دیر ہو رہی ہے۔ کالج پہنچنا ہے۔''

رحمان بدستور وہیل رینچ تھامے دشمن کی کمین گاہ کو کینہ توز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ساکت و جامد مجاہدانہ شان سے نورا مینگل بنا کھڑا تھا۔ اچانک بیلہ آگے بڑھی، اس کا لباس سمندری ہواؤں میں پھڑپھڑا رہا تھا، اس کے بال بکھر رہے تھے، اس کا لباس دور جھالاوان کے پہاڑوں میں اڑ جانے کے لیے

بیتاب تھا۔

تیز پاگل ہواؤں نے اس کا انگ انگ نمایاں کر رکھا تھا۔

پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اس نے وہیل رینچ دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر زبردستی چھیننا چاہا مگر محض ہل کے رہ گئی۔

''چھوڑ دو۔'' وہ غصے میں بولی۔ ''یہ مجھے دے دو۔''

اسی لمحہ رحمان کو احساس ہوا کہ کیا ہو رہا ہے۔

اس نے دیکھا' بیلہ اس کے بہت قریب ہے۔

اس نے دیکھا' بیلہ شعلہ بار نگاہوں سے اسے حکم دے رہی ہے۔

اس نے دیکھا' بیلہ بہت حسین لگ رہی ہے۔

اس نے وہیل رینچ چھوڑ دیا۔ کوچ کا وہیل رینچ بیلہ کے ہاتھوں میں آ گیا۔ بیلہ کو وزن کا اندازہ نہ تھا وہ گرتے گرتے بچی۔ وہیل رینچ ریت پہ جا گرا۔

یہ سب کچھ چشم زدن میں ہوا' پہلے تو کوئی کچھ بھی نہ سمجھا۔ پھر ایک ساتھ سینکڑوں قہقہے گونجے۔ ایک لمحہ میں میدانِ جنگ کشتِ زعفران بن گیا۔

بیلہ کی آنکھوں میں ندامت اور بے بسی کے آنسو امنڈ آئے وہ سر جھکائے تیز تیز چلتی اپنی سیٹ پہ آ بیٹھی' کھڑکی کے شیشے سے ٹیک لگا کر چہرہ جیکٹ سے چھپا کر سسکیاں لے کر رونے لگی۔

قہقہے گونجے' مسکراہٹیں چمکیں' اچانک ماحول بدلا تو باوردی سٹاف نے

موقعہ غنیمت جانا، جلدی سے باہر نکل آیا۔ رحمان اور دیگر ڈرائیوروں کو زبردستی گلے لگایا۔ اچکزیوں نے پتھروں والے پٹو جھاڑ دیئے، مگر جاتے جاتے بھی مبارزت کی دعوت دیتے گئے۔ "زوئے اس بار تو تم لوگ بچ گئے، آئندہ تمہارے ساتھ معلوم کریں گے۔"

اچکزیوں نے اتنی مسرت سے وعدہ کیا جیسے ان کی اگلی سالگرہ پہ کیک لے کر آنے کا یقین دلا رہے ہوں۔

—***—

اس رات جب رحمان کا فری ڈے شروع ہو چکا تھا۔

وہ ساحلِ سمندر کے اوپر بنے ریستورنٹ میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

"رحمان! تم نے مجھے اتنا شرمندہ کیا۔ ہزاروں لوگوں کے سامنے۔"

بیلہ کو اب تک گلہ تھا۔ "تم کیوں اتنی سی بات پر لڑنے مرنے پہ اتر آتے ہو۔"

وہ آپ سے تم پہ اتر آئے تھے اتنے مہینوں میں۔

"بیلہ تم نے کیوں روکا، ان کی بندوقیں تو بس دکھاوا ہیں، ڈراوا ہیں۔ انہیں بندوق چلانے کا کوئی خاص تجربہ بھی نہیں۔ رشوت خور ہیں۔ انہیں تو صرف پرامن شہریوں کو بے عزت کرنا آتا ہے۔ ہم سے منتھلی بھی لیتے ہیں۔ سمگلنگ روکتے تو پورا ملک سمگلنگ کے بعد کیسے بھرا رہتا۔ اسلام آباد اور راولپنڈی میں ایسی مارکیٹیں ہیں۔ انہیں بند کیوں نہیں کراتے۔ ہم اقلیت میں ہیں۔ ہمیں آنکھیں دکھاتے ہیں۔ میں دو چار آدمی تو مار ہی ڈالتا۔"

"پھر تمہارا کیا حشر ہوتا" جانتے ہو" بیلہ خوفزدہ ہو گئی۔

''میں نے تم سے محبت کی تم نے محبت میں تو دیکھا مگر لڑتے نہیں دیکھا۔ ہم تو موت کو جیب میں ڈال کر گھومتے ہیں۔'' بیلہ باہر دیکھنے لگی۔

منہ بسورے بیلہ ناراض بیٹھی تھی۔ ''زنجیر والوں نے تو ہمارے چیف جسٹس کو گلنگور کی چین پہ روک لیا تھا۔ اور روکنے والوں کا کچھ بھی نہ بگڑا۔ تم زیادہ لڑا مت کرو۔ ورنہ میں تم سے بات نہیں کروں گی۔''

بالآخر رحمان نے اسے منا ہی لیا۔ اور رات جب رحمان نے اسے ہاسٹل چھوڑا تو بیلہ نے کہا ''تم کتنے بہادر ہو۔ مجھے فخر ہے تم پر۔ تم میرے لیے جان دینے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔''

''کسی دن جان دے ہی ڈالوں گا، آزما لینا۔ اچھا تو پھر اس بہادر آدمی سے جلدی سے شادی کرلو۔''

اگلے روز رحمان کو وندر کراس پہ پیغام ملا کہ وہ خضدار میں کوچ دوسرے ڈرائیور کو دے کر خود وہیں سیٹھ شمروز کا انتظار کرے۔

رات دو بجے کے قریب جبکہ خضدار سو رہا تھا، رحمان کوچ سے اتر گیا۔ ہوٹل والے نے فوراً چائے پیش کی۔ براہوی گیتوں کا کیسٹ ہٹا کر پرانے بھارتی دوگانے لگا دیئے۔ جو محبت کرنے والوں کے لیے افیون کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہوٹل والے اس کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے تھے۔

بیلہ اور رحمان کی محبت کے افسانے اس روٹ پہ عام تھے۔ مہنگائی، بے روزگاری، کسمپرسی، محرومی، مجبوری اور بیماری کے ہاتھوں نالاں منہ کا ذائقہ

بدلنے کے لیے یہ عشقیہ کہانی شروع کر دیتے۔ ڈرائیور' کلینز' مستری پنکچر لگانے والے۔ سبھی بیلہ اور رحمان کے بارے میں اپنا مشاہدہ' اپنا علم بیان کرتے۔ تیس فیصد لوگوں کا خیال تھا کہ ان کی شادی ہو جائے گی جبکہ باقی سبھی کہتے تھے کہ بیلہ ایک سادہ دل ان پڑھ ڈرائیور کو ڈاکٹر بننے تک استعمال کرے گی۔ ڈاکٹر بنتے ہی پرانے ٹائر کی طرح رحمان کو لاکھوریاں کی جھاڑیوں میں پھینک دے گی۔

رحمان گیت سنتا' چائے پیتا' بیلہ کو یاد کرتا رہا۔ اسے یوں لگتا جیسے یہ سارے دو گانے وہ اور بیلہ گا رہے ہیں۔ کشور' ہیمنت اور مکیش اسے اپنے قریبی رشتہ دار لگتے۔ اگر لتا کبھی آتی تو رحمان اس کے لیے پورا کوچ خالی کر دیتا۔ اکیلے کوچ میں لتا کو سیریں کراتا۔ جہاں کہتی لیے پھرتا اور دربار ہوٹل کے نمکین روسٹ کھلاتا۔ شلوبے پلاتا۔ اور مستونگ کی جلیبیاں کھلاتا پھر اسے شیو دیوتا کے پرانے مندر لے جاتا۔

خدو بھی رحمان کے ساتھ ہی اتر گیا تھا۔ وہ بھی میز بجا بجا کر گیتوں پہ سر دھن رہا تھا۔ خدو کانٹوں کی نوک پہ مسکرانے والا نڈر تھا۔ مانو خوف چھو کے نہ گزرا تھا۔

انہیں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ سیٹھ شمروز کی قیمتی لینڈ کروزینگ اندھیرے چیرتی ہوئی بڑھتی چلی آئی اور ایک جھٹکے سے ہوٹل کے سامنے آ رکی۔ پیچھے پیچھے دو جیپوں میں چاک و چوبند محافظ بھی چلے آئے۔

سیٹھ شہروز غصے میں تھا اس نے رحمان کو اپنی گاڑی میں بٹھا لیا خود کو دوسری جیپ میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

سیٹھ شہروز نے رحمان کی سرزنش کی۔

''تم جانتے ہو تمہاری احمقانہ حرکتوں سے کتنا نقصان ہوتے ہوتے رہ گیا۔ تم بیسیوں انسانوں کو موت کے منہ میں جھونک بیٹھے تھے۔ اگر کوسٹ گارڈ کا ایک سپاہی بھی مر جاتا تو جانتے ہو کیا ہوتا۔''

''جھگڑا انہوں نے شروع کیا تھا۔'' رحمان نے منطق پیش کی۔

''شیر کی مرضی ہے انڈے دے یا بچے دے۔ وہ ہمارے آن داتا ہیں۔ ہمارے مالک ہیں، ہم غلام۔ وہ حاکم ہیں، ہم محکوم ہیں۔ ہم ان کی رعیت ہیں، جو چاہیں کریں۔ ان سے جھگڑا وارے میں نہیں ہے۔''

''میں نہیں مانتا' میرا باپ بھی نہیں مانتا تھا۔''

سیٹھ شہروز آگ بگولہ ہو گیا۔

''تمہارا باپ پہاڑوں میں لڑتا ہوا مارا گیا۔ ہم اس کا احترام کرتے ہیں مگر سوچو وہ کوسٹ گارڈ کا افسر بھی تو بن سکتا تھا۔ وہ اس نظام میں شامل ہو کر اس نظام کو بدل بھی تو سکتا تھا۔''

''اس نے جو کچھ کیا بلوچستان کے لیے کیا۔ تم میری رگوں سے وہ خون نکال دو۔'' رحمان نے سرد لہجے میں آگ انڈیل دی۔

''کاش میں سارے بلوچستانیوں کی رگوں سے خون نکال کر مصلحت

پنڈی بھر سکتا۔ مگر یہ کوچ کی ٹینکی نہیں ہے۔ جسے خالی کیا جاسکتا ہے۔"

"میں صرف اس ڈرائیوری پر زندہ نہیں ہوں، میں کچھ اور کام کراوں گا۔ ڈرائیور گاڑی روکو۔"

ڈرائیور نے سنی ان سنی کر دیں۔

سیٹھ شمروز اور مشتعل ہو گیا۔ "تمہیں میں نے اولاد کی طرح پالا۔ اب گاڑی سے اتر کر جا رہے ہو، نافرمان گستاخ۔ دل چاہتا ہے لگاؤں دو چار۔ پاگل عاشق کیا محبت صرف عورت سے ہی ہو سکتی ہے، جس نے اولاد کی طرح پالا اس سے نہیں۔"

رحمان اپنے رویے پہ ندامت محسوس کرنے لگا۔ پتھر اڑ رہے تھے۔ گاڑی برق رفتاری سے دوڑی چلی جا رہی تھی۔ سیٹھ شمروز غصے میں بولا۔

"لکوئی سے حب تک روٹی نہیں تھی، میں نے روٹ کو چلایا، دن رات اس روٹ پہ روزی ملتی ہے، پنکچر، ڈینٹنگ، الیکٹریشن، ہوٹل، تندور، پبلک کال آفس، دکانیں، میڈیکل سٹور حتیٰ کہ موچی اور نائی کو بھی یہاں روزگار ملتا ہے۔ میں روزگار ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لا رہا ہوں۔ تم یہ روٹ ہی بند کرانا چاہتے ہو، جیسے ہر نائی وولن مل بند کردی، سریاب ٹیکسٹائل مل بند کر دی، سینڈک پروجیکٹ بند کر دیا۔ پہلے چینی انجینئر اغوا کرائے کہ سرمایہ کار ہم سے ڈر جائیں سیریلا سیمنٹ فیکٹری بند کرا دی۔ حب کی تین سو فیکٹریاں بند کرا دیں، کیا کھاؤ گے؟ پتھر کھاؤ گے۔ اسی لیے اللہ نے یہاں اتنے پتھر پیدا کیے ہیں کہ سب پتھر

کھائیں؟''

رحمان سیٹھ شمروز کو اس سے پہلے عام سا انسان سمجھتا تھا۔ اسے پہلی بار اس کی عظمت کا اندازہ ہوا۔ کہ وہ بلوچستان میں خوشحالی دیکھنا چاہتا ہے۔ اور بڑا ہی نظریاتی انسان ہے۔

''دشمن تو چاہتے ہیں۔ یہاں کچھ نہ ہو تم ان کی مدد کرنا چاہتے ہو۔''

رحمان نے سر جھکالیا' اور تہیہ کیا کہ اگر سیٹھ اس کے ٹکڑے بھی اڑا دے تو وہ کچھ نہیں بولے گا۔ اس کے لیے رحمان نے ہونٹ سی لیے۔

گاڑی پتھر اڑاتی دوڑتی رہی' رحمان خاموش بیٹھا رہا۔

''دیکھو رحمان!'' سیٹھ شمروز کا لہجہ ناصحانہ تھا۔

''وسیع تر مفاد میں سوچنا سیکھو۔ اگر اقتدار میں آنا ہے تو صاحبِ اقتدار لوگوں میں شامل ہو جاؤ۔ لاہور اور اسلام آباد جابسو۔ فوج میں شامل ہو جاؤ۔ ناراض ہو کر پہاڑوں میں چلے جانے سے کیا ہوگا؟ جیسے بلوچستان کے افسروں نے بطورِ احتجاج سرکاری ملازمت سے استعفے دے دیئے تھے۔ عطاء اللہ دلھاری' اکبر خان کاکڑ' عبداللہ جان جمالدینی' کمال خان شیرانی اور بیسیوں دوسرے تعلیم یافتہ نوجوان جو اس علاقے کی تقدیر بدل سکتے تھے۔ انہوں نے علیحدگی اختیار کرلی اس نظام سے حالانکہ وہ اس نظام میں شامل رہ کر ہی اسے بدل سکتے تھے۔ لٹ خانہ بنا کر نظریاتی تعلیم دینے لگے۔ کہاں ہے وہ نظریاتی تعلیم۔ پیاس رہتی ہے' بھوک رہتی ہے' خواہشات رہتی ہیں۔ نظریات نہیں

رہتے۔ نظریات کو حقیقی ہونا چاہیے۔ Wish List کو نظریات نہیں کہتے۔"

معاً سیٹھ فیروز کو محسوس ہوا کہ اتنا کافی ہے۔ وہ خاموش ہو گیا۔

اگلے روز وہ اعلیٰ افسروں سے ملا' معذرت چاہی۔ رحمان کو ساتھ لیتا گیا تھا۔ مگر وہاں وہ رحمان کی وکالت بھی کرتا رہا کہ عملہ خوش اخلاق ہوتا تو ایسی نوبت ہی نہ آنے پاتی۔ رحمان کا تعارف اس نے اپنے بیٹے کے طور پر کرایا تھا۔ شمروز کو اعلیٰ افسروں سے گفتگو کرتے دیکھ کر رحمان عش عش کر اٹھا۔

"ان مسافروں کے ٹیکس سے تو سپاہیوں کو تنخواہ ملتی ہے۔ برطانیہ تو جا چکا ہے اب کالونیال رویئے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور ان کا نام بھی بدلنا چاہیے۔" "وہ کیسے" کمانڈر نے سوال کیا شمروز نے چائے کی پیالی میز پہ رکھ دی۔" انہیں گورنمنٹ سرونٹ کیوں کہتے ہیں۔ گورنمنٹ تو بدلتی رہتی ہے کبھی کوئی پارٹی کبھی کوئی۔ انہیں تو پبلک سرونٹ کہنا چاہیے۔ عوام کے ٹیکس سے یہ تنخواہ پا کر تو ملازمت کرتے ہیں۔" کمانڈر نے رائے دی "یہ پکڑ دھکڑ نہ ہو تو ہیروئین اور اسلحہ پھیل جائے۔"

شمروز نے گرہ لگائی "اس میں تو اب بھی کمی نہیں۔" ایک مشترکہ قہقہہ لگا۔

اور واپس جاتے ہو شمروز نے تنبیہ کی "بیلہ سے شادی کرلو۔ ایسے دھوم سے شادی کروں گا کہ لوگ یاد کریں گے۔ تمہیں بجار کرنے کی بھی ضرورت

نہیں۔"

"جی! ٹھیک ہے کرلوں گا۔" رحمان سیدھا ہو چکا تھا۔

"شاباش" شمروز نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ Regime سے لڑ سکتے ہو مگر State سے وفاداری اور اس کی حفاظت تمہارا فرض ہے۔"

اس روز بادل چھائے ہوئے تھے۔ بحرۂ عرب کی وسعتوں سے جہاں دور نیلے پانیوں میں جل پریاں رہتی ہیں آنے والی بھیگی ہوائیں کراچی میں اٹھکیلیاں کرتی پھر رہی تھیں۔ رحمان بیلہ کو طارق روڈ پہ لے گیا۔ کچھ شاپنگ کی پھر تین تلواروں والے چوک سے بیلہ کے لیے کپڑے خریدے۔ رحمان نے اپنا سوال دل میں سنبھال رکھا تھا۔ اور جب جلتا سورج سمندر میں دھیرے دھیرے ڈوب رہا تھا' پانی ذرا بھر گرم نہ ہوا۔ بیلہ کے بال بکھر بکھر جاتے اور وہ بہت ہی خوش تھی۔ زندگی میں سب کچھ اس کے خوابوں کے مطابق ہو رہا تھا۔ رحمان نے بہ اصرار شادی کے لیے کہا۔

سمندر کا شور تھا' لہریں یوں بڑھ بڑھ کے ریستورانت کی دیوار سے

ٹکرا رہی تھیں گویا اسے بہا ہی لے جانا چاہتی ہوں۔ بیلہ پل بھر میں دل گئی۔

''شادی کیسے کراؤں؟'' بیلہ لاتعلق سی ہوگئی۔ ''ابھی تو قرض اتارنے ہیں۔ ماں کا علاج ہے' بہنیں پڑھ رہی ہیں' کتنے سال لگیں گے' جاب کرنا ہے' پھر اپنا کلینک بنانا ہے' بہت سے سال چاہئیں' شائد میرے بال ہی سفید ہو جائیں۔''

''کتنے سال؟'' رحمان مبہوت سا رہ گیا تھا۔

''تقریباً دس سال۔''

رحمان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

''تمہاری ساری ضروریات یہ بہنوں کی شادیاں کتنے لاکھ میں ہوسکتی ہے۔ دس بارہ لاکھ میرے پاس ہیں۔ سیٹھ مجھے منہ مانگی رقم دے سکتا ہے۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔

''میں خود کمانا چاہتی ہوں اور کون سی شادی ؟ اب بھی تو تم میری بیوی ہو۔ تم نکاح نامے پر دستخط کو شادی کہتے ہو؟''

''نہیں تم بغیر لائسنس کی کلاشنکوف ہو' جسے میں زیادہ دیر ساتھ نہیں پھرا سکتا۔'' رحمان کو دکھ ہو رہا تھا۔ ''کمال ہے میری محبت کا یہ جواب۔ کیا میں اتنا برا ہوں۔''

''یہ محبت ہے یا بارٹر سسٹم۔ چیز کے بدلے چیز۔ کیا کچھ دے رہے ہو اور کیا لے رہے ہو۔ کوچ ڈرائیور جو سیٹ پر بٹھانے سے پہلے کرایہ لے لیتا

ہے۔ تم بھی اپنی محبت کی قیمت وصول کر لیتے ہو۔"

کچھ دیر بیلہ کھولتی رہی۔ پھر خود پر قابو پانے کے بعد اس نے وعدہ کیا کہ حالات بہتر ہوتے ہی شادی کر لے گی۔ فی الحال وہ شادی نہیں کر سکتی۔

"میں تم سے اتنا بڑا ہوں تو تب میری عمر کیا ہوگی؟ بچے کتنے بڑے ہوں گے!تب تک میں بوڑھا ہو جاؤں گا۔سیٹھ بھی چاہتا ہے کہ ہم شادی کر لیں۔"

"جائز اور ناجائز بچے ملا کر دنیا کی آبادی ساڑھے چھ ارب ہے۔ تم اس میں کیا اضافہ کرنا چاہتے ہو اور شادی سے کون سا فرق پڑے گا۔ ہم ایسے ہی تو رہیں گے جیسے کہ ہم رہتے ہیں۔ جنگلی! ہر چیز کو ٹائروں کی طرح روند دینا چاہتے ہو۔ بچے بھی پیدا کر لیں گے۔تم جوان ہو۔ عورتیں جلد بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ سیٹھ کو ہماری شادی سے کیا۔"

ایک سمندر رحمان کے دل میں اتر آیا۔

لہریں مارتا پیاسا سمندر۔

یہ کس قدر ظالم لڑکی ہے۔ اپنے پروگرام پر چلنے والی کمپیوٹر کی بچی۔

اس رات بیلہ کو ہاسٹل پہنچا کر پھر رحمان واپس دفتر نہیں گیا۔ بلکہ دوبارہ سمندر پہ چلا آیا۔ ساحل ویران پڑا تھا۔ دھرتی اور ساگر کا سنگھرش جاری تھا۔ اچانک سمندر جاگ اٹھا۔ اس کی لہریں بے لا، بے لا کہنے لگیں۔

رات بھر وہ ساحل پہ جاگتا رہا۔ دن نکلا تو نیند سے بوجھل آنکھیں

لیے ڈاکٹر سرور کے ہاں چلا گیا۔ ہسپتال میں مریض بھرے پڑے تھے۔ جانا پہچانا شور۔

رحمان بلا اجازت دفتر میں داخل ہوگیا۔ ڈاکٹر سرور حسبِ عادت خوشگوار موڈ میں تھا۔ ''واہ استاد رحمان What a Pleasant Surprise ویسے میں ہسپتال میں کبھی Welcome نہیں کہتا۔ خیر سے تو آئے ہو؟ کوئی پرابلم تو نہیں؟''

''بہت بڑا پرابلم ہے۔ ڈاکٹر صاحب! دل کا پرابلم ہے۔''

''یہ روسٹ کھا کھا کر تم نے کچھ تو کرنا ہی تھا۔ ہوتا کیا ہے؟''

''ہوتا یہ ہے کہ بیلہ سے عشق ہوگیا ہے' اور بہت زیادہ الجھ کر رہ گیا ہوں۔ آپ تو کہتے تھے کہ محبت اچھی چیز ہے۔''

''میں نے ٹھیک کہا ہے محبت تو گویا زندگی کے صحرا میں چھاؤں سے گزرنا ہے۔ میں نے زندگی بھر محبت ہی کی ہے۔ میرا تو کوئی پرابلم نہیں ہے۔ چلو تسلی سے بات کرتے ہیں۔''

سرور نے چائے کا کہا اور مریضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے رحمان کو ملحقہ کمرے میں لے گیا۔ جہاں مریضوں کا معائنہ کیا جاتا تھا۔ ''اچھا تو محبت کو تم نے دل کا روگ بنالیا ہے۔ استاد سپیڈ بڑھالی ہے محبت کی۔''

یتیمانہ صورت بنائے رحمان نے اسے تمام کہانی سنادی اور مشورہ چاہا۔

ڈاکٹر سرور نے دریافت کیا۔ ''تمہارا دل رکھنے کے لیے کہوں یا

حقیقتِ حال بیان کروں؟''

''سچ کہیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے میں کوئی سرکاری افسر تو نہیں کہ سچ برداشت نہ کرسکوں۔ میں دلیری سے سچ سن سکتا ہوں۔''

''بیلہ تم سے کبھی شادی نہیں کرے گی۔ وہ اپنا مستقبل بنا رہی ہے۔ وہ اپنے کسی ہم عمر ڈاکٹر سے شادی کرے گی تاکہ دونوں مل کر دولت کمائیں۔ بیلہ Target Oriented لڑکی ہے۔ اس کا ٹارگٹ اہم ہے تم نہیں۔''

رحمان سناٹے میں آ گیا۔

''مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' رحمان کو سرور پہ پورا بھروسہ تھا۔

''دراصل تم ایک بہت بڑی Addiction کے شکار ہوچکے ہو۔ قوتِ ارادی سے البتہ اس کا مقابلہ کرسکتے ہو۔ اور ہر Addiction آہستہ آہستہ چھوڑی جاتی ہے۔ یا اس کا بدل تلاش کرلو، کوئی اور عورت۔ ملک میں پانچ کروڑ تو عورتیں ہوں گی، تمہیں کیا فکر ہے۔''

رحمان حیرت زدہ سا بیٹھا تھا۔

''مگر میں تو بیلہ سے محبت کرتا ہوں۔ جانے یہ محبت ہے یا دیوانگی؟ ڈاکٹر صاحب محبت کیا ہے؟''

ڈاکٹر سرور نے آہ بھری۔ ''محبت ہی کی تو آج تک تعریف نہیں ہوسکی۔ اس کی بے شمار Defenitions ہیں۔ قدیم حکماء کہتے تھے کہ عشق و محبت مرگی کی ایک قسم ہے۔ مذہبی گیتوں اور جھاڑ پھونک سے محبت دور کرتے

تھے۔

قدیم یونانی کہتے ہیں کہ وینس کا بیٹا کیوپڈ اندھا ہے' وہ محبت کا تیر چلاتا ہے تو دو دلوں سے گزر جاتا ہے۔ دونوں محبت کرنے لگتے ہیں۔ چونکہ دیوتا اندھا ہے' دیکھتا ہی نہیں کہ کسے کس سے محبت ہونی چاہیے۔ لہٰذا محبت اندھی ہے Love اور Lust کا فرق بھی طے نہ کیا جاسکا۔ محبت کو پراسرار بھی کہا جاتا ہے۔بعض قوموں کا عقیدہ ہے کہ ہر جنم میں چاہنے والے دوبارہ آتے ہیں تو پچھلے جنم کے ساتھی کو پہچانے بغیر ہی اس سے شدید محبت کرنے لگتے ہیں۔بعض قومیں اسے ایک غیر مرئی اور آفاقی شے سمجھتی ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ دل خدا کے بس میں ہے' میڈیکل سائنس کہتی ہے کہ Love is Chemistry جسم سے نکلنے والے مادے Secretion والے کیمیکل جن دو جسموں کو آپس میں موزوں لگیں انہیں آپس میں محبت ہو جاتی ہے۔ مگر جسمانی اتصال کے بغیر بھی محبت ہو جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ ایک بہت بڑا موضوع ہے۔ جسے اب تک حل نہیں کیا جاسکا۔ محبت کا کوئی پراسرار تعلق Time and Space سے بھی ہے۔کسی خاص دور اور وقت میں شدید محبت ہوتی ہے۔ آنے والے وقت میں محبت کم ہو جاتی ہے ختم ہو جاتی ہے' اس کا مفہوم تو یہ ہوا کہ محبت Metaphysical ہے۔ محبت کا تعلق کھال سے بھی ہے۔ تبھی تو اسے لوگ Cutaneou Love بھی کہتے ہیں۔ یعنی کھال سے محبت عورت تو کہیں اندر ہوگی باہر تو اس کی کھال ہی ہوتی ہے۔"

چائے آ گئی، دونوں چائے پینے لگے رحمان بدستور کھویا کھویا سا تھا۔ سرور کے چہرے پہ کرشن بھگوان والی ازلی و ابدی مسکراہٹ تھی۔ جو مونچھوں کی طرح ہمہ وقت اس کے چہرے پہ موجود رہتی۔ وہ عموماً اسی موڈ میں رہا کرتا۔

''تم کیا چاہتے ہو رحمان!''

''میں بیلہ کو حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

''بیلہ کو تو تم کتنے عرصے سے حاصل کرتے چلے آ رہے ہو اور کیا حاصل کرنا چاہتے ہو تم اس کی کونسی چیز جیب میں ڈال کر اپنے گھر لے جانا چاہتے ہو۔''

رحمان جھینپ سا گیا۔ کتنا بے باک ہے ڈاکٹر، ذرا بھی لحاظ نہیں کرتا۔

''ڈاکٹر صاحب! کبھی آپ نے محبت کی ہے؟'' گھبرا کے رحمان نے بیلہ کا موضوع بدل دیا۔

سرور نے ایک آہ بھری۔ ''اس دل ناتواں نے سینکڑوں محبتیں کی ہیں۔ دل پہ زخم ہی زخم ہیں۔ ایکس رے میں دل کے ٹکڑے نظر آئیں گے۔ دل نہیں۔ ملکیت کا تصور قدیم قبائلی سوچ کی نشانی ہے۔ عورت کو شادی کر کے کھونٹے سے باندھ لینا فوجی حکومتوں کی طرح صرف تیسری دنیا میں ہی رہ گیا ہے۔ تم واقعی بیلہ سے شادی چاہتے ہو؟''

''جی ہاں میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ سیٹھ نے بھی کہا ہے۔''

''پیارے رحمان! یہ شادی ناکام رہے گی، چلے گی نہیں۔ آزار بن

جائے گی تم دونوں کی شادی' اگر ہوئی بھی تو سخت ناکام رہے گی۔ عمر کا فرق ہے' کلچر کا فرق ہے۔ ایسی لڑکیاں عموماً کئی مرد پالتی ہیں جو انہیں سپورٹ کرتے ہیں۔ عمر میں ان سے بڑے ہوتے ہیں۔ اسٹیبلش ہوتے ہیں۔ پھر ایک پپو ٹائپ چاکلیٹ ہیرو سے شادی کر لیتی ہیں۔ Exception can not deny "the Rule کبھی کے بارے میں ایک اصول نہیں ہوسکتا۔"

رحمان دکھ میں ڈوبا ہوا چائے پیتا رہا۔ وہ خاصا پریشان ہو چکا تھا۔

"سیٹھ شمروز سے بھی مشورہ لو' تم تو اس کے لاڈلے ہو۔اور ہاں کوئی Tranquilizer لینے کی کوشش نہ کرنا۔ ڈرائیو چرس کو غم کا علاج سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے' محبت بھی Tranquilizer ہے۔ حقیقت کی دنیا میں لوٹنا مشکل ہے' رفتہ رفتہ واپس آؤ۔ ایک دم سے بیلہ کو نہ چھوڑنا۔ بلکہ چھوڑنا ہی مت۔ گرمی سے سردی اور سردی سے گرمی میں یکدم باہر آنا منع ہے۔ تم تو محبت کے کمرے سے یک لخت نکلنا چاہتے ہو۔ صرف پانچ ڈگری کے فوری فرق سے مچھلیاں مر جاتی ہیں۔ انسان تو بیس پچیس ڈگری کا فرق بھی برداشت کرلیتا ہے۔ مگر تم میری رائے پر عمل کرنا۔ فیس بھی نہیں لوں گا۔ مشورہ مفت"

سرور نے قہقہہ لگا کر دوستانہ انداز میں رحمان کا کندھا تھپتھپایا۔

سرور کی تلخ باتوں نے رحمان کی زندگی میں زہر گھول دیا۔ وہ اپنا کوچ لے کر نکلا تو سوچتا ہی چلا گیا۔مسافروں کے لیے گیت لگے ہوئے تھے۔ جنہیں رحمان نہیں سن رہا تھا۔ کیا وہ ایک نئی عورت تلاش کرلے مگر وہ تو بیلہ سے محبت

کرتا ہے۔

صبح کاذب کے وقت وہ غوث آباد سے گزرا اندھیرے میں چلتن کی چوٹیاں سر اٹھائے لاتعلق سی کھڑی تھیں۔ لک پاس سے اترتی ہوئی سڑک ایک ٹیڑھی میڑھی لکیر لگ رہی تھی۔ جیسے کوئٹہ سانپ کی کنڈلی ہو' جس سے لہراتا ہوا سانپ ساراوان کی طرف بڑھ رہا ہو۔ لک پاس سے اتر کر ہزار گنجی سے کوئٹہ شہر کی روشنیاں نظر آنے لگتیں۔ ہزار گنجی' بابو شورش کا علاقہ۔ بابو شورش جو زمانے [illegible] کھا کے میر کریم امن بن گیا۔ رحمان کے والد کا دوست اور ساتھی۔ اس لیے ہزار گنجی سے گزرتے ہوئے رحمان کو بڑی اپنائیت کا احساس ہوتا۔ وہ بلندی سے نیچے اترنے لگتا۔ اس کے بعد اسے کوئٹہ میں داخل ہونا ناخوشگوار سا لگتا۔ انگریزوں کی فوجی چھاؤنی Colonial City کوئٹہ جہاں سے استعماری طاقتیں زہر کی طرح بلوچستان میں سرایت کر گئیں۔ استعماری طاقتوں کے محافظ جو بلوچستان میں زہر کے Drip لگا رہے ہیں۔ کتنا زہر پھیل چکا ہے۔ گاؤں گاؤں دشمنی' لڑائی' قتل و غارت' بدامنی' عدم تحفظ' ہتھیار رکھنے کی ضرورت' اسلحہ جمع کرنے کا جنون' قبائل کی جنگ ان جنگوں کو Monitor کرنے والے عناصر جونہیں چاہتے کبھی امن ہو۔ جونہیں چاہتے کبھی ترقی ہو۔ سارے بلوچستانی ایک دوسرے کو مارتے ہوئے مر جائیں۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ انگریزوں کی بنائی ہوئی فوجی چھاؤنی 1883ء سے اب تک کتنی بڑھ چکی ہے' پورے شہر پہ محیط ہوگئی۔ شہر شہر پھیل گئی۔ بوٹوں کی دھمک تو آتی

رہتی ہے' امن نہیں آتا۔ کیونکہ امن بندوقوں کی نالیوں سے نہیں نکلتا۔ اور اتنا عرصہ اس نے محض ایک لڑکی کے لیے سوچا۔ اس کے ہی سپنے دیکھے نہ ہی اپنے لوگوں کے بارے میں سوچا نہ ہی ان کے لیے کچھ کیا اور بھوک تو بدروحوں کی طرح گھر گھر مسلط ہے۔ چڑیلوں کی طرح گاؤں گاؤں قریہ قریہ۔ لوگوں کے کلیجے چبا رہی ہے۔ بلوچستان کو بھوک استان کیوں نہیں کہتے بھلا۔

رحمان نے عہد کیا کہ وہ ایک نئی سوچ نئی زندگی کا آغاز کرے گا۔ کوئٹہ پہنچ کر اس نے منشی کو آگاہ کیا۔ ''میں چند دن گاؤں میں رہوں گا۔ سیٹھ کو بھی بتا دینا۔'' منشی نے کھیسیں نکال دیں ''بیلہ کیسی ہے۔''

بیلہ کے ذکر پہ رحمان بہت خوش ہوا کرتا تھا۔ مسکرا اٹھتا۔ بعض اوقات بیلہ کا ذکر کرنے والے کو چائے کے پیسے بھی دے دیا کرتا۔ مگر آج رحمان نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے ''ٹھیک ہے وہ'' اور باہر نکل گیا۔ اپنے گاؤں وہ کئی ماہ بعد جا رہا تھا۔ بیلہ نے اس کا ذہن ہلا کے رکھ دیا تھا۔ اب وہ ایک طویل نیند سے بیدار ہوا تھا۔ اس نے اپنے آس پاس نگاہ دوڑائی۔

چہروں کو دیکھا، ماحول کو دیکھا' جس سے وہ کٹ کے رہ گیا تھا۔ اسے یوں لگا اسے باپ اور چچا کی روحیں پہاڑوں سے پکار رہی ہیں۔ مدد کے لیے بلا رہی ہیں، ایک نیا محاذ کھولنے کے لیے اکسا رہی ہیں۔ اسے لگا پہاڑ اور صحرا اسے آوازیں دے رہے ہیں۔ غیر مرئی طاقت سے اپنی محبت کا یقین دلا رہے ہیں۔ مہر گڑھ سے' پنجگور سے' تاگ سے' دلبندین سے اور جانے کس کس کونے سے۔

......❁......

جانے پہچانے درخت صحرائی ہواؤں سے الجھ رہے تھے۔ پتھریلی زمین پہ ریت ناچتی پھر رہی تھے اور ثورگز کے جنگلوں میں خرگوش گھوم پھر رہے تھے۔ زندگی متحرک تھی۔ مگر گاؤں اُداس تھا' برسوں سے بارش نہیں برسی تھی۔ لوگ باگ کہتے تھے کہ یہ راسکوہ کے ایٹمی دھماکے کا اثر ہے۔ فضاء میں گرد کی تہہ یوں منجمد سی معلق رہتی کہ سورج کی تمازت ہی نہ رہتی۔ یہ بھی کہا جاتا کہ تابکاری کا اثر دس ہزار برس تک رہے گا۔ جہاں بھی ایٹمی دھماکہ ہو قدرت ناراض ہو جاتی ہے۔ ندیاں خشک' کاریزیں خشک' چشمے خشک آسمان بھی روٹھ جاتا ہے۔ بادل بھی اس علاقے میں نہیں آتے۔ دھرتی ماں کے سینے میں زہر پھیل جاتا ہے۔ وہ دودھ کی بجائے زہر پلانے لگتی ہے۔ لوگ دھڑا دھڑ مرنے

لگتے ہیں۔ Brown Days آجاتے ہیں۔ دھول ہی دھول' گرد ہی گرد' مٹی ہی مٹی۔ ایسی ہی کیفیت گاؤں میں بھی تھی۔ بلوچستان کی فضاء پہ EL NINO کی گرفت تھی ان غیر معمولی وَر پر گرم ہواؤں کی وجہ سے بادل نہیں راہ پا رہے تھے۔ EL NINO قحط کی علامت ہوا کرتا ہے۔

درخت زرد ہو چکے تھے' ان پہ مردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ رحمان کے قریبی عزیز اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اس کا گھر کھولا گیا۔ مہینوں بعد تالے کھلے۔ سناٹا' ہر شے پہ دھول اور گرد کی طرح سناٹا تھا۔ گزرے سمے کی چاپ۔ آوازوں کی بازگشت تھی۔ مگر اب تو کوئی بھی نہ بچا تھا۔ گھر تو مکینوں سے جیتے جاگتے دکھائی دیتے ہیں۔ سانسیں لیتے ہیں۔ رحمان کو اندازہ ہوا کہ وہ رات یہاں نہیں گزار سکتا۔ اس کا دل Hose Pipe کی طرح پھٹ جائے گا۔

لیکن وہ جاتا تو کہاں جاتا؟ کوئٹہ کے ہنگامہ خیز دفتر میں' جہاں بھانت بھانت کے مسافر دن رات جانے کہاں کہاں سے چلے آتے ہیں۔ تانتا بندھا رہتا ہے انسانوں کا۔ جانے کیوں بھاگ دوڑ لگی رہتی ہے۔ ہر کوئی جلدی میں' جیسے آگ بجھانے جا رہا ہو۔ پتہ نہیں نو مہینے کیسے ٹھہرے رہتے ہیں۔ کراچی جانا اور بیلہ سے نہ ملنا یہ بھی محال تھا۔ گاؤں میں وحشت برس رہی تھی۔ گاؤں اب گاؤں نہیں رہے۔ شہر کسی بغیر ٹائر کے ٹیوب کی طرح پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ آس پاس کے گاؤں بھی اپنی کنڈلی میں لپیٹ لیتے ہیں۔

اتنے میں اس کے عزیزوں کو پتہ چل گیا۔ سبھی دوڑے چلے آئے۔

ہاتھوں ہاتھ لیا۔ کہیں سے چائے آئی کہیں سے کھانا۔ بڑی بوڑھیوں اور بچیوں نے پلک جھپکتے میں گھر ٹھیک کر دیا۔ رونق سے آ گئی دوست احباب آتے رہے۔ گھر میں میلہ سا لگ گیا۔ رات کے کھانے کے بعد سبھی رخصت ہوئے تو رات کمرے میں در آئی۔ اور دور کے ویرانوں سے دبے پاؤں تنہائی چلی آئی رحمان کو اکیلا پا کے ساتھ ہی آ بیٹھی۔ اور مستونگ دھیرے دھیرے اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔ آوازوں کے گرداب دم توڑتے چلے گئے۔آوازوں کے بھنور میں ڈوبے انسان نیند کی وادیوں میں کھو گئے۔ جہاں صورتیں ہوا کرتی ہیں، آوازیں نہیں۔ اتنی کٹھن اتنی طویل اتنی اذیت ناک رات یوں پہاڑ سی کٹے گی کیسے۔ لیکن تنہائی ایک اٹل حقیقت کی مانند قریب سے قریب ہوئی جاتی تھی۔ وہ کہاں جائے؟ کیا کرے۔ کیا بندوق اٹھا کر پہاڑوں پہ چلا جائے۔ پہاڑ بہادروں کے دوست ہیں۔ کمزوروں کو قبول نہیں کرتے۔ اسی سوچ و بچار میں تھا کہ کامریڈ چلا آیا۔ وہ رحمان کے بچپن کا دوست تھا۔ مگر نظریات کا شکار ہوگیا تھا۔ نظریات کے یرقان نے کہیں کا نہ رکھا۔ کوئی ڈھنگ کا کام بھی نہ کر پایا۔ بڑی بڑی باتیں کیا کرتا۔ بڑے بڑے نام لیا کرتا۔ دانشوروں کے، عقلمندوں کے جو ریاستی تشدد سے جیلوں میں مر گئے۔ پچھلے ہی دنوں سرکاری مہمان خانے سے لوٹا تھا۔ ریاستی تشدد سے ایک آنکھ سے کم دکھائی دیتا تھا۔ چال میں لنگڑاہٹ بھی آ گئی تھی۔ مگر اندر سے بہت مضبوط تھا۔ رحمان خوش دلی سے گلے ملا۔ کامریڈ نے حال احوال کے بعد چائے پی۔ ”کامریڈ یہ اچھا ہوا کہ تم آ گئے۔

مجھے ایک مشورہ چاہیے۔''

''بڑی خوشی ہوئی کہ تم مجھے کامیاب اور عقلمند انسان سمجھتے ہو۔ ناکام لوگوں سے مشورہ نہیں لیا جاتا۔ خیر تم کہو۔''

رحمان نے بیلہ کی کہانی سنائی۔ اس دوران چائے کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ رحمان کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتا تھا۔ اسے مکتی چاہیے تھی۔

''دیکھو رحمان! صرف وہ انسان خوش رہتا ہے۔ جو کسی بڑے مقصد کے لیے جیتا ہے۔ تمہارے والد اور چچا اس کی زندہ مثال ہیں۔ ایک شعور تو وہ دے گئے۔ تم اسے آگے بڑھا سکتے ہو۔ تم گواڑخ بن جاؤ۔''

''گواڑخ'' رحمان دلچسپی سے سن رہا تھا۔ ''وہ کیسے؟''

''شہیدوں کا خون ہر برس پتھریلی بنجر زمین سے ازخود گواڑخ کی شکل میں نمودار ہو کر جہاد کی دعوت دیتا ہے' تجدید وفا کا پیغام لاتا ہے۔''

''کامریڈ نے چائے کا پیالہ بھرا۔'' کمزور بے کس بے بس احتجاج نہیں کرتا۔ مقتل میں سبھی قتل ہوئے جاتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کا احتجاج بے معنی ہے۔ ہم علم کی طاقت حاصل کرلیں' ٹیکنالوجی حاصل کریں۔

استحصالی طاقتوں نے ہزاروں برس سے یہ یقین دلایا ہے کہ سب کچھ خالق کی مرضی و منشاء سے ہو رہا ہے۔ حکمران' سپاہی' پروہت یہ ایک مثلث ہے۔ تینوں مل کے چلتے ہیں اور ہزاروں برس سے دنیا پہ حکمرانی کر رہے ہیں ہمارے لیے تو کبھی بھی احتجاج نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہماری آواز دور تک نہیں جاتی۔

گواڑخ: گلِ لالہ۔ TULIP

جنرل ڈائر نے جلیانوالہ باغ میں فائرنگ کی تو پورا ہندوستان مشتعل ہوگیا۔ ہاؤس آف لارڈز تک گونج گئی۔ بلوچستان میں قتل و غارت کا بازار اسی رونلڈ ڈائر نے گرم کیا تو کسی نے بھی نوٹس نہ لیا۔ نہ مسلم لیگ نہ ہی کانگریس' نہ جمعیت علماء ہند نے۔ دھرتی خود احتجاج کرتی ہے۔ ہر سال بلوچستان کے دل کے پھپھولے گواڑخ کی شکل میں باہر آجاتے ہیں۔ یہ گواڑخ نہیں انگارے ہیں' آگ ہے احتجاج ہے' جو دشت دشت پھیل جاتا ہے' جس پر نہ دفعہ 144 لگتی ہے' نہ ہی فرنٹیئر لاء ریگولیشن لگتا ہے۔ گواڑخ سے تجدید وفا کرو۔ گواڑخ نہیں' یہ شہیدوں کا خون ہے۔ وقت تم سے جہاد کا طلبگار ہے۔ علمی جہاد' معاشی جہاد و معاشرتی جہاد۔''

کامریڈ دم لینے کو رکا تو رحمان نے پوچھا ''مگر میں تو ڈرائیور ہوں۔ ایک محدود تنخواہ ہے۔ بیلہ کا مسئلہ بھی ہے۔ میں کیا کرسکتا ہوں؟''

''تم پہلے ارادہ تو کرو' پھر عمل کرو۔ یہ اتنی بڑی حویلی خالی پڑی ہے۔ کچھ کمرے اور بناؤ۔ اسے سکول بنادو۔ ایک نئی نسل کے لیے اپنی زندگی داؤ پہ لگا دو۔ ڈسپنسری بنوا دو۔ اپنے گھر میں مفت جگہ دو تو کام ہوسکتا ہے۔ شادیاں تو سبھی کرتے ہیں' بچے پیدا کرتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ محمد حسین عنقا کیوں جیل میں رہے؟ غوث بخش بزنجو پچیس برس کیوں جیل میں رہے؟ کتنا عرصہ ہے پچیس برس جانتے ہو۔ کوئٹہ سے کراچی پہنچنے میں تمہیں دس گیارہ گھنٹے لگتے ہیں۔ پھر ایک دن ریسٹ مل جاتا ہے۔ پچیس برس چلا سکتے ہو کوچ؟ حالانکہ

اس میں سہولت بھی ہے، گیت بھی ہوتے ہیں۔''

رحمان کانپ کے رہ گیا۔ کتنے بڑے لوگ تھے وہ سب۔کتنی قربانیاں دیں۔

کامریڈ نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔

''بلوچستان میں بھی ان علاقوں نے ترقی کی ہے جہاں ہائی سکول تھے بارنس ہائی سکول سبی 1888ء میں قائم ہوا' نوشکی اور تربت کے سکول' مستونگ کا ہائی سکول۔ سکول اور کالج کا ترقی سے گہرا تعلق ہوا کرتا ہے۔ گھر میں سکول قائم کردو۔ بیلہ کو سگریٹ نوشی کی طرح غیر اہم کردو۔''

اگلے ہی روز قریبی عزیزوں کو بلا کر رحمان نے سکول قائم کرنے کا اعلان کردیا۔ کامریڈ کو سکول کا سربراہ مقرر کردیا گیا۔ رحمان نے احباب کو تاکید کی کہ وہ گاؤں والوں کو مجبور کریں کہ بیکار لڑکوں کو سکول بھجوایا کریں۔ کتابیں بھی بچوں کو دی جائیں گی۔ دوپہر کا کھانا بھی۔

اس روز چوتھی بار گھر میں گہما گہمی تھی۔ پہلی بار جب والد اور چچا کے دنیا سے چلے جانے کی خبر ملی تھی۔ دوسری بار والدہ کی موت پہ اور اس کے بعد دادی کی موت پہ۔ سالہاسال کے بعد قہقہے تھے' فقرے بازی تھی' رونق تھی۔

سبھی اسکول میں دلچسپی لے رہے تھے۔ بعض ایک نے مالی امداد کا بھی عندیہ دیا۔ ایک نوجوان نے جو یوں تو چھوٹا موٹا کاروبار کرتا تھا وعدہ کیا کہ بلا معاوضہ تین چار گھنٹے بچوں کو انگریزی پڑھائے گا۔ اچانک وہ بکھرے

ہوئے لوگ ایک گروپ بن گئے۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد ایک ایک کرکے مہمان رخصت ہوتے چلے گئے۔ آخر میں کامریڈ رہ گیا جو حسبِ عادت نظریاتی گفتگو کرنے لگا۔

''بیلہ' کو جانے دو۔ کچھ نہیں ملے گا۔ کیا کرو گے' زیادہ سے زیادہ شادی کرلو گے۔ ہر گھنٹے میں ساڑھے آٹھ ہزار بچے پیدا ہو رہے ہیں۔ ہر سال 33 لاکھ بچے ملکی آبادی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ تم بھی سات آٹھ بچے پیدا کرلو گے بیلہ سے اور بس۔ کسی عظیم مقصد کے لیے زندہ رہو۔ سب کہتے ہیں ہمیں وطن کیا دے رہا ہے؟ تم کہو ہم وطن کو کیا دے رہے ہیں۔ اپنے آپ کو ختم کرنا پڑتا ہے' تو نئی زندگی ملتی ہے۔ گندم کا دانہ خاک میں ملتا ہے تو اسی بیج سے خوشۂ گندم نکلتا ہے۔ جس میں بے شمار بیج ہوتے ہیں۔ تم اپنی زندگی ایک بڑے مقصد کے لیے وقف کردو، ضمیر بھی مطمئن رہے گا زندگی بھی بامقصد رہے گی۔ اور تم اپنا حق بھی ادا کر جاؤ گے۔ اس دھرتی کا حق بھی تو ہے تم پر۔''

''مگر بیلہ! بیلہ بھی تو میرے لیے بہت ہی ضروری ہے۔''

''شاید! جس قدر خوشی تمہیں ملتی ہے بیلہ سے اس سے بڑھ کر ملے گی جب بچے پڑھ لکھ جائیں گے۔ جب علاقے کو حقوق مل جائیں گے۔ تمہارا نام بھی امر ہو جائے گا۔ جس قدر بیلہ پہ خرچ کرتے ہو' اس کا آدھا حصہ بھی سکول پہ خرچ کرو۔ نئی نسل پہ خرچ کرو۔ خلوص ہو تو مخیّر حضرات خود مدد کے لیے آجائیں گے لوگ عبدالستار ایدھی کی امداد اس لیے کرتے ہیں کہ انہیں ایدھی

کے خلوص پر یقین ہے۔ رہی بیلہ، تم ایک نیا رخ دو تعلقات کو۔ اسے سب کچھ بتا دو۔ صاف صاف بات کرو وہ کیا چاہتی ہے؟ پوچھ لو اس سے۔ تعلقات کو ذہن کا عذاب نہ بناؤ۔ روح کا بوجھ نہ بناؤ۔ زبردستی کی کیا شادی؟ کیسی رفاقت؟ مالی غلامی ہے یہ تو۔ معاشی آزادی ملتے ہی بیلہ کی مالی غلامی بغاوت میں بدل جائے گی۔''

کامریڈ نے بڑے کام کی باتیں بتائیں، جب کامریڈ خدا حافظ کہہ کر اندھی سڑک پہ نظروں سے اوجھل ہوا تو رحمان لوٹ آیا گھر میں۔ گھر کی اداسی اور ویرانی غائب ہوچکی تھی۔ بہت سے لوگ تھے بہت سی امیدیں اس کے ساتھ تھیں۔ اس نے دوبارہ سبز چائے پی اور گہری نیند سو گیا۔

اس نے دیکھا کہ ننھے منے بچے اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔ بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ افسر بن رہے ہیں۔ فوجی وردیاں پہنے شان سے پھر رہے ہیں۔ حسبِ روایت ان کے سینے تمغوں سے سجے ہوئے ہیں۔ تمغے ہی تمغے، ہر سال نئے تمغے۔

وہ حمید بلوچ کو پھانسی گھاٹ سے زندہ واپس لا رہے ہیں۔

انہوں نے پھانسی گھاٹ توڑ ڈالا اپنے بوٹوں سے۔

انہوں نے جلادوں کو کچل ڈالا۔ جو نواب نوروز خان اور اس کے ساتھیوں کو پھانسی دینا چاہتے تھے۔

انہوں نے ساری جیلیں توڑ ڈالیں ہر چیک پوسٹ اکھاڑ پھینکی جہاں

بلالحاظ مرد و زن انسانوں کی تذلیل کی جاتی تھی۔عقوبت خانے ڈھا دیئے۔پھر وہ
رحمان کو سلامی دیتے ہوئے گزرنے لگے' اور پھر ٹینک آئے' اور پھر جہاز آئے'
گھن گرج کے ساتھ امریکی جہاز امریکی ٹینک امریکی اسلحہ، امریکی ڈالر امریکی
اسلام اور میڈ ان امریکہ کا لیبل لگائے سپاہی اور دانشور اس فوجِ ظفر موج کو
دیکھ کر امریکی صدر تالیاں پیٹنے لگا۔

اور رحمان جاگ اٹھا۔ کئی سالوں بعد بادل گرج رہے تھے۔ بارش ہو
رہی تھی' وہ برآمدے میں نکل آیا۔ صبحِ کاذب کا وقت تھا۔ اگرچہ وہی گھر ویسا
ہی خالی تھا۔ مگر اس خالی پن میں نرالی رونق تھی۔ جیسے خالی کوچ بھی خالی نہیں
لگتے۔ زندگی بہت اچھی لگ رہی تھی جیسے جیون کی نئی صبح طلوع ہو رہی۔
مگر اس کے اندر کا مرد فاقہ کشی کا شکار رہا۔

بیلہ کی ضرورت اسے پکارتی رہی۔ مگر اگلے دو روز بہت مصروف
گزرے' سکول کا نام Tower of London تجویز ہوا۔ بورڈ شہر میں بننے
کے لیے دیا گیا۔ شہر اور گاؤں کا تفاوت یوں تو ختم ہو چکا ہے۔ شہر اور گاؤں
گٹر لائن کی طرح آپس میں غلط ملط ہو چکے ہیں۔ کون بتلائے کہ کہاں سے
شہر ہے کہاں سے گاؤں ہے؟ جیسے سمجھ میں نہیں آتا کہ عورت کہاں سے شروع
ہو کر ختم کہاں ہوتی ہے۔

اگلے روز اسی نئے سکول میں جو کبھی ویران گھر ہوا کرتا تھا پھر میلہ سا
لگ گیا۔ سکول کے بارے میں استفسار کرنے والے' مدد کے لیے آگے بڑھنے

والے' ننھے منے بچوں کے والد' ماموں یا چچا مسرور تھے کہ سکول قائم ہو رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ پڑھ لکھ کر ان کے بچے بھی چپڑاسی کلرک یا دفتری کی نوکری حاصل کرلیں۔بڑی ملازمتیں تو کمیدانوں اور بڑے لوگوں کے پاس ہوتی ہیں۔ اکثریتی صوبے کے پاس ہوتی ہیں۔ ہندو اکثریت سے ڈر کر بھاگنے والے کب کے قومیتوں کے حق میں ہندو بن چکے تھے۔ مگر زندہ تو رہنا ہے۔ اصل چیز تو زندہ رہنا ہے۔ عقیدے تو بعد کی چیز ہیں۔ جیسے بمپر کوچ سے پہلے آتا ہے۔

رحمان کے گھرانے کے نوجوان رضاکارانہ طور پہ مہمانوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے' چائے کے دور چل رہے تھے۔

رحمان کی آنکھوں میں بیلہ جھلملا جاتی۔ اس کے ذہن کے عقبی آئینہ میں بیلہ دکھائی دینے لگتی۔ وہ گفتگو سے کٹ سا جاتا' کھو سا جاتا۔ جسے پُر جوش حاضرین اس کی غیر حاضر دماغی پہ محمول کرتے۔

کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ سکول کا نام اسلامی ہونا چاہیے۔ حالانکہ یہی طے کرنا مشکل تھا کہ کون سا اسلام؟ کامریڈ نے تسلی بخش جواب دیا' وہ سکون سے سنا کرتا تھا بطور اچھا سامع۔ اور پھر بڑے تحمل سے جواب دیا کرتا تھا۔

''سرمایہ دارانہ نظام نے کمیونزم کا مقابلہ کرنے کے لیے اسلام کا سہارا لیا۔ ترکی سے بنگلہ دیش تک اسلام پسندوں کی دیوار بنا دی۔اخوان المسلمین اور اسلامی جماعتیں بنائیں۔ انہیں بے تحاشا امداد دی۔ کمیونزم کو لادینی طرزِ زندگی قرار دے کر نفرت پھیلائی۔ مسلمانوں میں جوش اور مذہبی جنون پھیلایا۔ اب

چونکہ کیمونزم بظاہر ختم ہو چکا ہے۔ لہٰذا اب وہ سرمایہ دارانہ طاقتیں اسلام پہ ٹوٹ پڑی ہیں۔ وہ اپنے مقابل کوئی طاقت نہیں دیکھنا چاہتے۔"

ایک نوجوان تذبذب میں تھا۔

"مسلمانوں نے تو ان کی اتنی مدد کی تھی۔"

"ہاں! مگر مسلمان ایک طاقت بن رہے تھے' طاقت اپنے مقابل میں طاقت برداشت نہیں کرسکتی۔ ہاتھی اور شیر میں کیا دشمنی ہے؟ ہاتھی سبزی کھاتا ہے اور شیر گوشت' پھر لڑائی کس بات کی۔ امریکی ڈالر سے لڑی جانے والی جنگ اسلامی جہاد کیسے قرار دی جاسکتی ہے؟"

کسی دل جلے نے سوال کیا "سکول کا نام Tower of London کیوں رکھا ہے؟"

کامریڈ تو علم کا سمندر تھا۔

"یہ ٹاور علم کا نام بلند کرے گا' جہالت کے جیل توڑے ڈالے گا۔ یہ طنزیہ نام ہے' باغیانہ نام ہے۔

برطانیہ کے دانشوروں' آزادی پسندوں کو حکمران لندن کے Tower میں قید رکھتے۔ جیسے راجر بیکن کو میر غوث بخش بزنجو کی طرح پچیس برس قید رکھا۔ ہمارا Tower ایک ایسا محل ہوگا جو آزادی' شعور اور علم کی بات کرے گا۔ قید کی بات نہیں کرے گا۔ آزادی کی بات کرے گا۔ یوں بھی لوگ انگریزی ناموں پہ گرتے ہیں۔ حاکم کبھی محکوموں کی زبان نہیں بولتے۔ حاکم

ہماری زبانوں کو بھی مقامی زبانیں کہہ کر ایک طرف پھینک چکے حالانکہ یہ قومی زبانیں ہیں۔ مقامی زبانیں کہاں ہیں؟ انگریزی میں ہی ہماری بھی بقا ہے۔ اسی کے ذریعے ہم حاکموں میں شامل ہو سکتے ہیں۔"

بات لوگوں کی سمجھ میں آ رہی تھی؛ "آمروں کی طرح زبانوں کا دور ہوتا ہے۔ ایک آمر اگر مرتا ہے تو دوسرا آ جاتا ہے۔ ایک مارشل لاء جاتا ہے تو نیا آ جاتا ہے۔ بعینہٖ کبھی سنسکرت کبھی فارسی کبھی اردو کبھی انگریزی کا دور چلتا ہے۔ دور گزر جاتا ہے تو زبانیں بھی اہمیت کھو بیٹھتی ہیں۔ مر جاتی ہیں۔"

اچانک کامریڈ کو خیال آیا کہ ایسی عالمانہ گفتگو کی یہ محفل متحمل نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا وہ خاموش ہوگیا۔ اس نے اپنی بجھی ہوئی بیڑی دوبارہ سلگائی۔ اتنی علمیت کے باوجود کامریڈ بیڑی کے ٹوٹے اور بھوک پہ قابو پانے کے لیے کڑک چائے کا اسیر تھا۔ جہاں سرسوتی ہو وہاں لکشمی نہیں آتی۔

"جہالت کب مرے گی؟"

مزید سوال ہوا۔

ایک قہقہہ بلند ہوا۔

رحمان نے فقرہ کسا "بلوچستان میں آ کر مر جائے گی؛ بھوک اور پیاس سے؛ پولیس کی مار پیٹ سے؛ جھوٹے مقدموں سے؛ لیویز؛ پولیس ملیشیا؛ بلوچستان کانسٹیبلری؛ بی سکاؤٹس؛ ریزرو پولیس؛ فرنٹیئر کانسٹیبلری سے۔" سبھی قہقہے لگانے لگے۔

''بلوچستان میں انسان کم ہیں' سپاہی زیادہ ہیں۔''

اتفاق میں کیسی برکت ہے' رحمان نے طمانیت محسوس کی۔کل تک یہ ایک ویران مکان تھا' اب کیسا بارونق کیسا آباد گھر ہے۔ اور اگر بیلہ شادی کے لیے رضامند ہو جائے تو زندگی کیسی شاندار ہو' جیسے بغیر چھت کے BMW کار۔ جیسے سیاہ رنگ کی بڑی بتیوں والی مرسڈیز۔

اسکول کا انتظام کامریڈ کے سپرد کرکے رحمان چند روز بعد کوئٹہ چلا آیا۔ اب تک اسکول کا بہت سا کام باقی تھا۔ جسے صرف اجتماعی طور پہ ہی کیا جاسکتا تھا۔

اسکول کے لیے ہر ماہ رقم کی ضرورت تھی۔ رحمان نے بینک میں اسکول کا اکاؤنٹ کھول دیا تھا۔ تاکہ کامریڈ کو رقم حاصل کرنے میں دشواری پیش نہ آئے۔ اس نے اپنا سارا سرمایہ اسی اکاؤنٹ میں منتقل کر دیا۔ رحمان کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ سر اٹھا کے چلنے کے قابل ہوگیا ہے۔ دل میں ایک خیال جاگزیں تھا کہ اسکول کے ذریعے تعلیم عام ہوگی۔ غریب اور متوسط حال سبھی مستفید ہوں گے۔

اتنی محنت کے بعد رحمان تھک سا گیا تھا۔کوچ چلانا تو آسان ہے مگر ایک ادارہ چلانا، پوری ذمہ داری لینا خاصا دشوار تھا۔ مگر رحمان نے اوکھلی میں سر دے دیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اب کی بار پہاڑوں کی بجائے شہروں میں لڑا جائے۔ بندوق سے نہیں قلم سے، علم کے زور سے۔ چیونٹی پہاڑ سے لڑ سکتی ہے

اگر پہاڑ جتنی طاقت حاصل کرلے۔ سول نافرمانی سے۔ جمہوری جنگ سے اسمبلی کے اندر، میڈیا کے زور سے اور حقوق کے لیے لڑتا تو جہاں ہے۔ بھلا انسان بنیادی حقوق بھی نہ مانگے۔ رحمان کو پہلی بار اپنی اہمیت کا اندازہ ہوا۔

سیٹھ شمروز اکیلا ہی بیٹھا چائے پی رہا تھا' باہر مسلح گارڈ موجود تھے' دفتر میں داخل ہوتے ہی منشی نے سرگوشی کی تھی ''مبارک ہو۔ نیا کوچ تمہارے لیے آیا ہے''

عملے کی تو جان جاتی تھی سیٹھ سے۔ وہ تھا تو سخت گیر مگر محض انتظامی لحاظ سے۔ ورنہ تو بہت خیال رکھتا سب کا اور انہیں تنخواہیں بھی معقول دیا کرتا۔ عید تہوار پر بونس بھی دیا کرتا۔ عملہ اس سے ڈرتا تو تھا مگر محبت بھی کرتا تھا۔ ان کے دل میں اس کا احترام تھا۔ شمروز کرسی سے اٹھ کر ملا۔ وہ بھی رحمان کے بعد اداس ہوگیا تھا۔

''رحمان! کہاں رہے؟ شکر ہے کہ برسوں بعد گاؤں میں تمہارا دل تو لگا۔ کہیں سے فون ہی کر دیتے نالائق انسان۔''

ساتھ ہی اس نے چائے کے لیے اشارہ کیا۔

''میں نے ایک بہت بڑا کام کیا ہے سیٹھ، میں نے اپنے گھر میں اسکول کھول دیا ہے۔ مفت، بغیر فیس کے۔''

''شاباش آخر ہو کس کے بیٹے! بیلہ کے زیادہ پیچھے بھاگنے کی بجائے سکول پر توجہ دو۔ مجھے خوشی ہوئی ہے تم نے خاندانی روایت کو زندہ رکھا۔''

شمروز نے دراز سے چابی یوں پھینکی کہ میز کے شیشے سے تیرتی ہوئی رحمان کے پاس آ گئی۔

''نیا کوچ لیا ہے، پچھلی طرف کھڑا ہے، بیلہ تم خود لکھوا لینا۔ ہاں! علم میں میرا بھی حصہ ڈالنا تم بھول گئے، منشی ہر ماہ دس ہزار روپیہ کامریڈ کو اسکول کے لیے بھجوا دیا کرے گا۔''

''دس ہزار'' رحمان نے احتجاجی انداز میں پوچھا۔

''اچھا چلو بیس ہزار۔ منہ کیوں بسور رہے ہو پچیس ہزار۔''

رحمان بدستور کھڑا شمروز کو دیکھتا رہا۔ جواب طلب نظروں سے ''اچھا تیس ہزار اب جاؤ گے بھی یا لگاؤں ایک ہاتھ۔'' شمروز نے مکہ بلند کیا۔

رحمان مسکراتا ہوا باہر نکلا۔ چمکتا دمکتا نیا مرسڈیز کوچ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا اپنا عملہ موجود تھا۔ خدو گلے ملا ''استاد کدھر چلے جاتے ہو۔ روٹ ہی ویران ہو جاتا ہے۔ استاد مجھے بھی اسکول میں داخل کرلو۔''

''داخل کرلوں گا پڑھو گے انگریزی'' رحمان نے حوصلہ افزائی کی۔

"بوڑھے طوطے نہیں پڑھ سکتے۔" ایک کلینئر نے فقرہ کسا۔ خدو پیچ کس لیے اس کے پیچھے دوڑا۔ سبھی ہنسنے لگے۔ "بچاؤ۔ بچاؤ۔" کلینز دائرے میں گھوم رہا تھا۔ یہ زندگی کے ٹھکرائے ہوئے' معاشرے کے ستائے ہوئے لوگ تھے۔ جو انہی لطیفوں اور قہقہوں میں زندہ رہتے تھے۔ کمپنی نے اصل سیٹوں کی بجائے قریب قریب سیٹیں لگوا رکھی تھیں۔ یوں مسافروں کو تکلیف تو ہوتی۔ مگر زیادہ سیٹوں کی وجہ سے کمپنی کو فائدہ ہوتا۔ کسی مسافر نے کبھی بھی اس کے خلاف احتجاج نہیں کیا۔ ان کے لیے تو اتنا ہی کافی تھا کہ ڈھائی سو روپے میں راتوں رات کراچی یا کوئٹہ پہنچ جاتے ہیں۔

رحمان ڈرائیوروں' کلینزوں میں بیٹھ کر شمروز یا کامریڈ کا علم اپنے الفاظ میں دہراتا تو سبھی دم سادھے سنا کرتے۔

"ریلوے کے افسران کی جیب گرم کردی جاتی۔ کوئٹہ سے کراچی ٹرین رینگتی چلتی جاتی۔ کراسنگ کے نام پہ بار بار روک لیا جاتا۔ حتیٰ کہ جو بھی مسافر ایک بار ٹرین میں جاتا، دوبارہ نام نہ لیتا۔ بلکہ اپنی اولاد کے نام بھی وصیت کر جاتا کہ کبھی بھی ٹرین میں کراچی جانے کا نہ سوچے۔ ورنہ ہمارے کوچ دھرے کے دھرے رہ جاتے۔ جن میں نہ واش روم ہے نہ ہی آرام' پہیوں پہ بے محابہ دوڑے چلے جاتے ہیں۔ جان کا تحفظ بھی نہیں ہے۔"

پھر بھی کوچوں پہ اژدھام لگا رہتا۔ مسافروں کو جان کی پرواہ کب تھی۔ وہ تو روپیہ اور وقت بچانا چاہتے تھے۔ "کرپٹ ریلوے ہماری کامیابی کا سبب ہے۔" رحمان کش لگاتے ہوئے تبصرہ کرتا۔

......❁......

اور سورج بہت روشن روشن سا تھا۔

کراچی پہ سمندری ہواؤں کا راج تھا۔

بیلہ کی طلب اسے کھینچ رہی تھی۔ جانے یہ میری محبت ہے یا میری ضرورت۔ کامریڈ کی باتیں سن کر وہ خود سے سوال کیا کرتا۔ اور نئے کوچ کی طرح بیلہ بہت حسین لگ رہی تھی۔ سفید اوورآل میں وہ بے حد دلکش دکھائی دے رہی تھی۔

مگر بیلہ کچھ روٹھی روٹھی سی تھی۔ ''تم اتنے دن کہاں رہے۔''

سمندر رنگ بدل چکا تھا۔ اس میں نیلاہٹ آچکی تھی۔ دوپہر کا بھورا پن غائب ہوچکا تھا۔ بڑے بڑے شیشوں سے دور تک کھلا سمندر نظر آرہا تھا۔

بیلہ جوس پی رہی تھی اور رحمان چائے! بیلہ مہکی مہکی سی دمک رہی تھی کوچ کی طرح۔

"تم اتنی چائے کیوں پیتے ہو؟ تمہارا بلڈ ٹیسٹ کروں تو آدھی چائے ملے گی۔ تم اتنے اجنبی کیوں ہو جاتے ہو؟ کیوں بدل گئے تھے فریبی دھوکے باز دونمبر۔"

"بیلہ میں کیا کروں؟ مجھے لگتا ہے میں ایک بے بس کیڑا ہوں جسے بے شمار چیونٹیاں جہاں چاہے گھسیٹ لیے جاتی ہیں۔ میں بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں مگر اب تک کچھ نہیں کرسکا۔" بیلہ کے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں سونے کا گول رنگ پکار رہا تھا کہ اس کی رجسٹریشن ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر سرور کے مشورے سے رحمان نے بیلہ کو انگوٹھی پہنائی تھی۔ تاکہ دور سے ہی Applied for Registration نظر آئے۔ کسی کی منگیتر پر لوگ کم ہی لائن مارتے ہیں۔ یوں بھی بلوچستان میں منگنی اور نکاح کا درجہ برابر ہے۔ اور منگیتر بھی ایک جسیم باغی کوچ ڈرائیور کی۔ خطرہ 440 وولٹ تھی بیلہ۔ ادھر بیلہ رحمان سے کہہ رہی تھی کہ اس کی زندگی ایک مشن ہے۔ "خاندان کا ڈومی سائیل سرٹیفکیٹ بنانا ہے۔ جس کے بعد اس کی بہنوں کو پروفیشنل کالجز میں داخلے ملیں گے۔" قرض اتارنا ہے۔ بہنوں کی شادی کرنا ہے۔ ماں کا علاج کرانا ہے، مکان بنانا ہے۔" بیلہ کسی ماہر وکیل کی طرح رحمان کی زبان بند کر دیتی۔

"میں تم سے محبت تو کرتی ہوں، میں تمہاری ہوں۔ مگر باقاعدہ شادی کرلی تو تم مجھے ملازمت نہیں کرنے دو گے۔ چادری پہنا کر گھر میں بٹھا دو

گے۔ مجھے غیر قانونی DNC بھی نہیں کرنے دو گے۔ میرا گھرانہ کیا کرے گا۔ روپیہ کہاں سے آئے گا۔"

رحمان اس کا حل چاہتا تھا۔ "سیٹھ کہتا ہے کہ شادی کرلو۔ سمجھ نہیں آتی تم یہ سب کچھ کیسے کرلو گی اکیلے اکیلے۔"

بیلہ بولنے پہ آتی تو زخمی کر دیتی۔ بیلہ نے طویل سانس لی۔ "میں نے اپنے آپ کو بیچ دیا ہے تمہارے ہاتھ۔ اپنے خاندان کے لیے میں خوشی سے بک گئی ہوں تم نے ٹرک ڈرائیوروں والی محبت کی۔ وہ بھی میں نے برداشت کرلی۔ کوئٹہ کراچی روٹ پر تم نے مجھے بدنام کردیا۔ اب کوئی مرد مجھ سے شادی نہیں کرے گا۔ سوائے اس خوبصورت جوان کے جو Intestines سے کمانے کے بعد میرے ٹکڑوں پہ پلنا پسند کرے گا۔ اپنی محبت کا جھانسہ دے کر۔ اور موقعہ مل جائے تو میرا ہی کنڈکٹر بن جانے کی کوشش کرے گا۔"

رحمان کو سخت طیش آیا۔ "زبان سنبھال کر بولا کرو' اٹھا کر باہر ماروں گا۔ شیشہ توڑتی ہوئی سمندر میں جا گرو گی۔"

بیلہ مسکرائی۔ "اتنی ہمت ہے؟ ہے! پھر زندہ کس کے سہارے رہو گے۔"

"اسکول کے سہارے۔" رحمان نے لاپرواہی جتائی۔ بیلہ نے چڑایا

"اچھا تو اسکول کے ساتھ ہی سویا کرو۔"

ڈاکٹر سرور نے مشورہ دیا تھا کہ محبت کا اظہار نہ کیا جائے۔ رحمان نے اسے اسکول کے بارے میں تفصیلاً بتایا' پھر وہ دنوں اٹھے اور اپنی جنت میں

آ گئے۔ قدرتی زندگی میں بس اسٹینڈ میں ہی سٹاف کے لیے اٹیچ باتھ کے سنگل روم تھے۔ رحمان کے لیے ڈبل روم تھا۔ بیلہ کو وہاں جانے میں تامل رہتا۔ بیلہ کو اچھے ریستورنٹ پسند تھے' اور رحمان کو اپنا کمرہ جہاں اس کی حکومت تھی۔ جہاں بیلہ کوچ کی طرح اس کے قبضے میں آ جاتی۔ جہاں موڑو اسٹرینگ چاہے جیسے کاٹو۔ جیسے تھرائل دو۔

ان ہی دنوں جب رحمان نہایت سنجیدگی سے بہت سی دولت حاصل کر کے بیلہ کے خواب پورے کر دینا چاہتا تھا۔ مٹی کے کمروں کی بجائے پختہ اسکول بنا دینا چاہتا تھا۔ اس کی مڈبھیڑ سلمان سے ہوگئی۔ بہت امیر کبیر انسان تھا سلمان۔

چالیس پچاس لاکھ کی لینڈ کروزنگ میں اپنے محافظوں کے جلو میں گھومتا پھرتا۔ شمروز اسے ناپسند کرتا تھا کہ ڈرگ مافیا کا آدمی ہے۔ کہتے تھے کہ اس کا تعلق کاروان سے بھی ہے۔ کاروان ڈرگ مافیا کا وہ قافلہ تھا جو مسلح ہو کر افغانستان سے نکلتا' نوشکی کے بالائی حصے سے بلوچستان میں آمد ہوتی۔ بلوچستان میں سفر کرتا ایران میں داخل ہوتا اور ترکی تک مارتا کاٹتا پہنچ جاتا۔ اکثر سورما اسے دیکھ کر راستہ بدل لیتے۔ کارواں کے پاس طیارہ شکن اسلحہ تک موجود ہوتا۔ 106 ملی میٹر کی ریکوائیس رائفلیں جیپوں پر فٹ ہوا کرتیں۔ ڈھونڈ ڈھانڈ کر وہ مشہور مجرموں کو بھرتی کیا کرتے۔

ویارو کے پاس کوچ کا ٹائر پنکچر ہوگیا تھا۔ عملہ ٹائر بدل رہا تھا۔ کہ قریب سے سلمان گزرا وہ بھی کوئٹہ ہی جا رہا تھا' اس کی گاڑی ریسورس میں

واپس آئی۔ ''استاد رحمان! خیر ہے۔ کوئی مدد چاہیے؟''

رحمان نے شکریہ ادا کیا۔ اور بتایا کہ محض ٹائر بدل کے چل پڑے گا۔

''استاد انجیرہ پر میرا ایک آدمی ہوگا' میرا ہمزاد ہوگا۔ میرا ہم شکل ہوگا استاد اسے بٹھا لینا' گیئر بکس کے ڈھکن پر بٹھا لینا۔ اس کے پاس سونے کی چڑیا ہے' وہ بھی دیکھنا۔'' اتنا کہہ کر سلمان نے ڈرائیور کو گاڑی بڑھانے کا اشارہ کیا۔ دھول اڑاتی گاڑی کسی بگولے کی طرح غائب ہوگئی۔

انجیرہ کے پاس سڑک پہ ایک شخص رکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ کوچ تو ایسے مسافروں کے لیے نہیں رکتے کہ ساری نشستیں پر ہوا کرتی ہیں۔ مگر اتفاقاً ایک مسافر زاواہ کے لیے راستے میں ہی اتر گیا تھا۔ نووارد سیٹ پر بیٹھنے کی بجائے انجن کے ابھرے ہوئے ڈھکن پر آبیٹھا۔ جہاں ایرانی سومک جڑا ہوا تھا۔ رحمان متحیر رہ گیا۔ نوارد سلمان ہی تھا۔ بظاہر وہ ایک تباہ حال مسافر لگ رہا تھا' بال بکھرے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں کھجور کی لکڑی کے دانوں کی تسبیح تھی۔ مسافر اپنے آپ میں مگن تھے' کچھ سو رہے تھے۔ کچھ اونگھ رہے تھے۔ کچھ تسبیح پھیر رہے تھے کنکھیوں سے عورتوں کو دیکھ رہے تھے توجہ بٹتی تو دوبارہ تسبیح کے دانوں پر سود خوروں کی طرح گن گن کر خدا کو یاد کرنے لگتے۔ پھر کبھی دانے آہستہ گھمانے لگتے۔ رات کے تین بج رہے تھے۔

''رحمان استاد! کب تک جوانی برباد کرو گے' کوچ تو خون پی جاتا ہے۔ شمروز تم جیسے کتنے جواں مردوں کی جوانی چاٹ گیا۔ ڈرائیوری میں زندگی

کا بھی بھروسہ کیا؟'' سلیمان نے بلاتمہید تقریر شروع کر دی۔

رحمان کی نظریں سڑک پر تھیں' وہ مہارت سے موڑ کاٹ رہا تھا' گیئر بدل رہا تھا۔ کوئٹہ سے آنے والے کوچ کراس کر چکے تھے۔ سڑک نسبتاً صاف تھی۔

رحمان بھی سلمان کا مضحکہ خیز حلیہ دیکھ کر بے تکلف ہوگیا اور مسخرہ پن کرنے لگا۔ ''سیٹھ شمروز کے بارے میں کچھ کہا تو میرے کلینز تم کو بھی ڈھکن اٹھا کر اندر پھینک دیں گے۔ انجن کے اوپر تمہارا روسٹ بن جائے گا۔''

نووارد نے کوئی اثر نہ لیا۔ ''بھائی میں تو خوشحالی اور دوستی کا پیغام لایا ہوں۔ یہ ٹیلی فون نمبر رکھ لو۔ اگر ہمارے ساتھ کام کرو گے تو لکھ پتی بن جاؤ گے۔ بیلہ بھی ہمیشہ کے لیے تمہاری ہو جائے گی۔ اسکول بھی بن جائے گا۔ تمہارا علاقہ خوشحال ہو جائے گا۔ غربت ختم ہو جائے گی۔ تمہارے والد اور چچا نے تو حقوق کی جنگ میں جان دے دی۔ چیونٹی پہاڑ سے جا ٹکرائی۔ تم ایک خطرہ لینے کے لیے بھی تیار نہیں۔ خطرات سے کھیلنا تو مردوں کی شان ہے۔ کس کے بیٹے ہو اور کیا کر رہے ہو۔ کتنی بے معنی زندگی ہے تمہاری۔''

''کتنا کچھ یہ میرے بارے میں جانتا ہے۔ کتنا چلاک ہے۔''

رحمان کو ناگواری سی محسوس ہوئی۔

بڑا چرب زبان تھا سلمان بھی۔ رحمان کو ایسے لوگ برے لگتے تھے۔ اس نے لاتعلقی سے گیئر بدلا۔ ''تم اتنا کچھ جانتے ہو میرے بارے میں۔ اچھا تو مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''کچھ بھی نہیں ہر پھیرے صرف ایک سوٹ کیس لے جانا ہوگا۔ ہمارا آدمی وصول کر کے ایک لاکھ دے جائے گا۔''

رحمان نہ پھسلا۔''یہ کام تو کوئی بھی کرسکتا ہے۔ میں ہی کیوں؟''

''پیارے! تم سچے اور کھرے انسان ہو۔ تم پر کوئی شک بھی نہیں کرتا' ہم تو سب کی نظر میں ہیں۔ پھر یہ کہ ہم تو تمہیں چھڑا سکتے ہیں بچا سکتے ہیں، ہم پہ آفتاد پڑی تو کون مدد دے گا۔''

کوچ اندھیروں کو چیرتا آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ روشنیاں گھوم کر اندھیروں پہ پڑتیں۔

بہروپیا' غیر سنجیدہ اور زندہ دل سلمان مسلسل بولے جا رہا تھا۔ نہ تو زبان کا کلچ پکڑتا نہ بریک ہی لگاتا۔ اس کی زبان انجن کے کریک کی طرح چلتی جا رہی تھی۔ رحمان خاموش ہی رہا۔ اور چپ چاپ سلیمان کی لچھے دار باتیں سنتا رہا۔

سوراب کی روشنیاں ٹمٹمانے لگی تھیں۔

''سوٹ کیس میں کیا ہوگا؟'' رحمان کا سوال واضح تھا۔

''کچھ بھی نہیں محض کپڑوں میں پوشیدہ تھوڑی سی ہیروئن ہوگی۔''سلیمان مسکرایا۔

''ہیروئن سے تو لوگ مر جاتے ہیں۔''

''لوگ بغیر ہیروئن کے بھی تو مر جاتے ہیں' جہاز گرنے سے' ٹرین الٹنے سے۔ مرنا تو مقدر ہے' باقی دنیا کیوں مر جاتی ہے۔ خالی ہیرونچی تو نہیں

مرتے۔ یہ ہیروئن امریکہ اور یورپ کے لوگ پیتے ہیں۔ دنیا کی اسی فیصد دولت ان کے پاس ہے۔ سود کے نام پر ہم سے دولت نچوڑ کر لے جا رہے ہیں۔ ملازموں کو نوکریوں سے نکال رہے ہیں۔ ٹیکس پر ٹیکس لگائے جا رہے ہیں۔ بجلی پر ٹیکس، دوائیوں پر ٹیکس، مکانوں پر ٹیکس، سانس لینے پر ٹیکس، ان کا قتل جہاد ہے۔ ہمارے بچے بھوک اور افلاس کا شکار ہیں۔ گیراجوں میں کام کرتے ہیں۔ سفید چمڑی والے کبھی افغانستان پر حملہ کرتے ہیں کبھی عراق پر! کبھی ایران پر۔ ہماری باری بھی سمجھو کہ آنے والی ہے۔ ہم کیوں نہ لڑیں۔ مار ڈالیں گے ہم انہیں ہیروئن پلا پلا کر۔ یہ بھی جہاد ہے، بندوق سے نہیں تجارت سے۔"

سلمان کی باتیں رحمان کے دل پر اثر کر رہی تھیں۔ اس کا اپنا دل بھی چاہتا تھا کہ اپنا کوچ امریکی صدر پر چڑھا دے، مگر شمروز کو کیسے دھوکہ دے۔

"مجھے سوراب پر اتار دینا۔" سلمان نے تاکید کی اور ساتھ ہی ایک پیکٹ تیزی سے نکال کر اس کے قدموں میں پھینک دیا، جسے کوئی بھی نہ دیکھ سکا۔ بظاہر تو یوں دکھائی دے رہا تھا کہ دو بے تکلف دوست گپ شپ مار رہے ہیں۔

"میرا دل نہ دکھانا، واپس نہ کرنا یہ تو ایک دوست کی جانب سے معمولی سا نذرانہ ہے۔ ایک لاکھ روپیہ ہے۔ پچاس ہزار اسکول کے لیے باقی رقم بیلہ کے لیے۔ چاہے کام کرو یا نہ کرو۔ ہم تمہارے دوست ہیں۔ دوست رہیں گے۔"

کوچ سوراب پہ رک گیا۔ بائیں جانب سوراب اندھیرے کا کمبل اوڑھ کر

سڑک سے دور سو رہا تھا۔ ہائی وے پر دکانیں البتہ کھلی تھیں۔ ہوٹل پہ گیت لگے ہوئے تھے' ٹائروں کی دکان پر ہوا بھرنے کی مشین ٹھپ ٹھپ کرتی چل رہی تھی۔

صرف پہاڑ جاگ رہے تھے بھیڑیئے آبادیوں کے قریب نکل آئے تھے۔

''ٹائر چیک کرو خدو۔'' رحمان نے آواز لگائی۔

''رحمان! دوستی دوستی ہوتی ہے۔ کسی انسان کا سر بھی مانگو تو طشت میں رکھ کر لادیں گے۔ یہ مردوں کی دوستی ہے۔ اپنے لیے کیا جینا' اپنے بچوں کو بچالو۔ اب کوئی اور رحمان پیدا نہ ہو۔ جو تمہاری طرح تکلیف دہ بچپن گزارے۔''

سلمان گرمجوشی سے ہاتھ ملا کر اتر گیا' مسجد کی آڑ میں ایک سٹارٹ پجارو سلمان کی راہ دیکھ رہی تھی۔

رحمان نے کوچ آگے بڑھایا۔ بچپن میں وہ کیسے راہ دیکھا کرتا تھا اپنے والد کی اور چچا کی اور چچا نے وعدہ کیا تھا کہ پہاڑوں سے اتر کر آئے گا تو اسے نیا کوٹ لے کر دے گا اور بہت سی جلیبیاں بھی دلوائے گا۔ لیکن وہ خود ہی اپنے پرانے گھسے ہوئے کوٹ میں گولیوں کا نشانہ بن گیا۔

اور آج اسے لاکھوں روپے مل سکتے ہیں تو محبت کرنے والے ہی نہ رہے یادوں نے پھر یلغار کر دی۔ وہ ہیروئن کا کام ہرگز نہیں کرے گا۔ ایک لاکھ کا پیکٹ اس نے جیب میں ڈال لیا۔ اس کا خیال تھا روپیہ پیسہ زندہ چیز ہے اگر اس کی بے عزتی کراؤ ٹھکراؤ تو روٹھ کر چلا جاتا ہے دوبارہ واپس نہیں آتا۔

بیلہ پچاس ہزار روپیہ لے کر بہت خوش ہوئی۔ اس کا چہرہ چمک اٹھا۔ آنکھوں میں نرالی سی مسرت موجیں مارنے لگی۔ وہ خوشی خوشی رحمان کے کمرے میں جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ روپیہ اور زیور اس کا موڈ بدل دیا کرتے۔ وہ اچانک خوش اخلاق ہو جایا کرتی۔بیلہ ہلکے میک اپ میں تھی۔وہ رحمان کے ساتھ جاتے ہوئے پرس میں میک اپ کا سامان ساتھ لیے پھرتی۔

''تم میرا میک اپ کھا جاتے ہو۔ جنگلی! اس سے بہتر ہے کہ کسی بیوٹی پارلر سے تم یہ سب کچھ اچھی طرح کھا کر ہی آیا کرو۔''

بیلہ ہلکے بادامی رنگ کے مردانہ شلوار قمیض میں ملبوس تھی۔ بادامی رنگ ہی کی مردانہ واسکٹ پہنی ہوئی تھی۔ پاؤں میں کالے جوگر تھے۔

ایک ساتھ پچاس ہزار پا کر وہ بہت خوش تھی' اور بس اڈے کے اپارٹمنٹ میں جانے کے لیے خوشی سے تیار ہوئی تھی ٹیکسی ہسپتال سے ہی مل گئی تھی۔

''تم کتنے اچھے ہو۔'' وہ بہت قریب آ گئی۔

''تمہیں اتنے عرصے کے بعد پتہ چلا کہ میں اتنا اچھا ہوں۔''

رحمان ہنسا ''تمہاری آنکھوں کا وائپر بلیڈ شائد نیا لگا ہے۔''

''یہ اتنی دولت کہاں سے لی؟''

رحمان نے ٹیکسی ڈرائیور کی جانب اشارہ کیا۔

''گھر جا کر بتاؤں گا۔'' وہ اکثر اپنے کمرے کو گھر ہی کہا کرتا تھا۔

بیلہ بہت خوش تھی۔ بات بے بات قہقہے لگا رہی تھی۔

ناشتے کے بعد بیلہ نے پھر سوال دہرایا تو جواب دینے کی بجائے رحمان نے اس سے سوال کیا کہ کیا وہ اپنے خاندان کو بچانے کے لیے رحمان کو بچانے کے لیے اپنے آپ کو فروخت کر سکتی ہے۔ بیلہ کا جواب اثبات میں تھا۔ رحمان نے بیلہ کو پوری کہانی سنائی۔ وہ ڈانواں ڈول تھا۔ فیصلہ کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ سب سے جانکاہ کام شمروز کو دھوکہ دینا تھا۔ بیلہ بھی کوئی جواب نہ دے سکی۔ رحمان نے فون نمبر سنبھال رکھے۔ بیلہ کو بھی لکھوا دیا۔ وہ ہر چیز میں بیلہ کو شامل کرنے کا عادی تھا۔

''کچھ عرصہ ہیروئن کاروبار کر لیتے ہیں۔ بعد میں چھوڑ دیں گے۔ اور

میں نے خود سے حلف اٹھایا ہے کہ تم سے وفادار رہوں گی۔ میرا ذہن بدل گیا ہے۔ تم کوئی بھگوان قسم کے انسان ہو۔ چلو مسجد میں حلف اٹھاؤں۔" رحمان مسکرایا۔ "مجھے یقین ہے تمہاری زبان پہ۔"

اُن ہی کشمکش کے دنوں میں اچانک قیامت ٹوٹ پڑی۔ شمروز کا جواں سال بیٹا قتل کر دیا گیا۔ قبائلی لڑائیوں میں ایک اور بے گناہ مارا گیا۔ رحمان دیر سے پہنچا۔ جنازے میں تو شامل نہ ہوسکا۔ لیکن فاتحہ پر بیٹھا رہا۔ بیلہ کے والد بھی تین روز فاتحہ پہ بیٹھے رہے۔ یہ معصوم سا لڑکا جو چند سال پہلے پتنگ اڑایا کرتا تھا' دفتر کے سامنے غبارے والے کو دیکھ کر مچل جایا کرتا تھا۔ جس نے بارہا رحمان کے ساتھ فٹبال کھیلا۔ میٹرک کا طالب علم جو اب تک کمپیوٹر کی دنیا سے باہر نہیں نکلا تھا۔ بیلہ بھی چھٹی لے کر چلی آئی تھی اور زنانہ حصے میں سارا سارا دن خواتین کو تسلی دیتی۔ کبھی خود بھی رونے لگتی۔ غش کھا جانے والی خواتین کو سنبھالنے لگتی۔ ایک کہرام بپا تھا۔ شمروز کی بیوی کی تو بری حالت تھی۔ شمروز

بڑی ہمت سے فاتحہ لے رہا تھا۔

نمائندین' سردار' نواب' اعلیٰ افسران آ رہے تھے۔ ملک بھر میں روڈ ٹرانسپورٹ بند ہو جانے کا خدشہ تھا۔ کورکمانڈر کے پیچھے پیچھے مؤدب سا چلتا گورنر بھی تعزیت کے لیے آیا' اس قتل پہ ہر طرف ایک احتجاج تھا۔

تعزیت کے لیے آنے والوں کو چائے پیش کی جا رہی تھی۔ دیگیں چڑھی ہوئی تھیں۔ رحمان انتظامات میں لگا رہتا۔ چند راتیں تو وہیں قالینوں پہ ڈھیر ہو کر شامیانوں کے نیچے سو رہتا۔ پھر بیلہ کے ابو بہ اصرار اسے رات کو گھر لے جایا کرتے۔

رات گئے دبے پاؤں بیلہ چلی آتی اس کے کمرے میں۔

مگر رحمان بے حس و حرکت اندھیرے میں چھت کو گھورے جاتا' سگریٹ پھونکتا رہتا۔ کبھی رات کے دو بجے چائے مانگتا کبھی چار بجے۔ بڑا ابنارمل سا ہوگیا تھا۔ کھویا کھویا سا رہتا۔ اس کے احساسات ختم ہو چکے تھے۔ وہ پتھر بن چکا تھا۔

ایک رات بیلہ سے نہ رہا گیا۔

''تم مجھ سے اتنی دور دور کیوں رہنے لگے ہو؟''

''میں نے قسم کھائی ہے کہ جب تک میں قتل کا بدلہ نہیں لوں گا' تمہارے قریب نہیں آؤں گا۔''

''مگر میں تو قریب آ سکتی ہوں۔''

"نہیں بیلہ! میرا راستہ مت روکنا۔ میرا سفر کھوٹا نہ کرنا۔ مجھے ایک حساب چکانا ہے۔ میں ایک براہوی ہوں، دشمن سے بدلہ لینا میرا ایمان ہے۔"

پھر شامیانے اتر گئے۔ شمروز دوبارہ دفتر آنے جانے لگا۔ ان دنوں رحمان بھی بیلہ کو لے کر کراچی چلا گیا۔ پھر شمروز کو محسوس ہونے لگا کہ رحمان اسے نظر انداز کرنے لگا ہے۔ کوچ لے کر آتا تو باہر نکل جاتا۔ کراچی جاتا تو دفتر کے سامنے سے گزر جاتا۔ آنکھ تک نہ ملاتا۔ شمروز نے رحمان کو بلوا بھیجا۔

رحمان سر جھکائے مجرموں کی طرح کمرے میں داخل ہوا۔

"کیا بات ہے رحمان! تمہارا رویہ بدلا ہوا ہے۔"

رحمان بدستور نظریں جھکائے معتوب مجرموں کی طرح کھڑا تھا۔

"مجھے معاف کردو سیٹھ' میں اسے بچا نہ سکا۔ مگر میں یہ وعدہ کرتا ہوں کرتا ہوں کہ بدلہ لوں گا۔ اس وقت تک تمہارے سامنے نہیں آؤں گا۔"

شمروز غم کا زہر پی چکا تھا۔ "وہ لوگ غائب ہوچکے ہیں۔ قاتل ملے نہیں' انہوں نے میرے بیٹے کی گاڑی چھلنی کردی مگر حکومت کے پاس گواہ نہیں۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ قاتل کون ہیں؟ میں نے پولیس کو کیس نہیں دیا۔"

"پولیس تو بس رنڈی کے کوٹھے کا طبلچی ہے۔ میں خود نپٹ لوں گا۔ تم فکر نہ کرنا۔ سیٹھ میں نے خدا سے دعا مانگی ہے اس وقت تک زندہ رہوں جب تک بدلہ نہ لے لوں۔"

رحمان سر جھکائے کھڑا تھا۔ "سیٹھ مجھے آئندہ اپنے سامنے مت بلانا۔

میں بدلہ لیے بغیر تمہیں منہ نہیں دکھاؤں گا۔" اور پھر اجازت لیے بغیر رحمان باہر نکل گیا۔ جہاں اس کا کوچ چلتن کی جانب رخ کیے تیار کھڑا تھا۔ شمروز نے نہ روکا وہ جانتا تھا کہ منع کیا تو رحمان کا دل پھٹ جائے گا۔

اس کے بعد رحمان کبھی بیلہ کے پہلو میں نہ آیا۔ وہ ہمہ وقت سوچتا رہتا۔ مختلف لوگوں سے رابطے کرتا۔ لیاری کے خطرناک ڈرگ مافیا سے ملتا۔ مجرموں کے بدنام زمانہ اڈوں پہ جاتا۔ وہ دنیا کی ہر شے بھول چکا تھا۔ اسے بدلہ لینا تھا۔ اپنے محسن کے بیٹے کا۔ رحمان کھویا کھویا رہتا۔ ویرانوں میں وہ پستول سے نشانہ بازی کرتا۔ کراچی میں ایک ریٹائرڈ کمانڈو کو اس نے باقاعدہ تنخواہ پہ استاد مقرر کرلیا تھا۔ وہ اسلحہ کے استعمال میں مہارت حاصل کرتا رہا۔

......✿......

بیلہ نے اس کے ہاتھ سے سگریٹ کا پیکٹ چھین کر مروڑ دیا۔ سامنے موجیں مارتا سمندر تھا۔ سورج دھیرے دھیرے سمندر میں ڈوب رہا تھا۔ پانی کے اندر سورج بجھتا جا رہا تھا۔ ایئرکنڈیشن ہال کے باہر مرطوب ہوائیں کراچی پہ چھائی سپر ڈسٹ میں مدغم ہو رہی تھیں۔

"رحمان! مجھے بتاؤ تمہارے لیے میں قتل کردوں گی۔ عورت زیادہ آسانی سے کام کرسکتی ہے۔ میرے ذہن کا آدھا حصہ مردانہ بھی تو ہے۔ بولو کسے مارنا ہے۔"

"پتہ نہیں کہ وہ ہیں کہاں پر؟" رحمان کھویا ہوا تھا۔

"سمجھ نہیں پاتا کیا کروں۔" معاً ایک برق سی کوندی۔

بیلہ نے رحمان کا ہاتھ تھام لیا۔ "سنو رحمان! تم نے کسی سلمان کا بتایا تھا۔ جس نے کہا تھا کہ وہ کسی کا سر کاٹ کر بھی لاسکتا ہے۔"

"ارے ہاں! میں تو فاتحہ پر بھی اس سے ملا تھا۔ اس کا نمبر نکالو۔ جلدی سے۔"

رحمان نے موبائل بیلہ کے سامنے رکھ دیا۔ بیلہ نے پرس سے ٹیلی فون ڈائریکٹری نکالی۔ سلمان کے باقی نمبروں سے پہلے اس کا موبائل نمبر ڈائیل کیا۔ کال مل گئی۔ بیلہ جذباتی ہوگئی۔ "سلمان صاحب! سلمان صاحب! اچھا آپ رحمان سے بات کریں۔"

رحمان کو نئی زندگی مل گئی۔ چہرے پہ چھائی نقاہت اور پژمردگی کافور ہوگئی۔

"سلمان! کیا حال ہے؟ تمہیں یاد ہوگا۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ فلاں چیز تم پلیٹ میں لاکر دے سکتے ہو۔"

سلمان اتفاقاً کراچی میں ہی تھا۔ اور صدر کے علاقے میں گھوم پھر رہا تھا۔ اس نے پتہ پوچھا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد وہ ریسٹورانٹ میں داخل ہوا۔ اس کے ہمراہ دو آدمی اور بھی تھے جو الگ سے ایک قریبی میز پر بیٹھ گئے۔ وہ دونوں شخص مسلح، محتاط اور خطرناک محسوس ہو رہے تھے۔ سلمان خوش دلی سے ان کے پاس آ گیا۔ رحمان کو دیکھ کر مسکرایا۔ "پارٹنر شپ مبارک ہو۔ مل کر کام کرنے کا لطف ہی اور ہے۔" سلمان نے اٹھ کر ہاتھ ملایا۔ بیلہ بھی احتراماً کھڑی

ہوگئی۔ سلمان چہک رہا تھا۔

''عبدالرحمان کی تو عبدالرحمیاں۔ دور سے آپ بالکل لڑکا لگ رہی تھیں۔ میں تو سمجھا رحمان ذوقِ ایرانی...... اچھا مجھے کافی پلائیں۔'' بیلہ اتنی ثقیل اتنی دقیق گفتگو نہ سمجھ سکی۔ مسکراتی رہی۔ کمبخت تھا خاصا رومینٹک۔ کافی آئی تو بولا۔ ''اپنے ہاتھوں سے بنا کر دیں' بڑا عرصہ ہوا کسی خوبصورت خاتون کے ہاتھوں کی کافی نہیں پی۔'' مسکرا مسکرا کر بیلہ کو دیکھے جا رہا تھا۔

''رحمان! ایک بڑا پرانا گانا ہے جب انڈیا میں نوے برس بعد دو قومی نظریے کا کیک کٹا تھا۔ یعنی جب سلائیس بنے تھے 1947ء میں۔

او لڑکی

تو لڑکی ہے یا لڑکا

تجھے دیکھ کے دل میرا دھڑکا۔

بیلہ کو دیکھ کر وہی گیت یاد آ رہا ہے۔''

رحمان کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اتنی تعریفوں پر وہ مسکرائے یا پہلے قاتل کا سر اتارنے کی بات کرے۔ سلمان انجیرہ پہ ملا تو دیہاتی لباس میں تھا۔ جیسے سیوی کے میلے سے بیل خریدنے آیا ہو۔ اب سوٹ میں تھا' کلین شیو بڑا مہذب اور تعلیم یافتہ دکھائی دیتا تھا۔ رحمان نے اسے بتایا کہ وہ قاتل کو نہیں اس کے اکلوتے بیٹے کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ مگر اپنے ہاتھوں سے۔

''میں چاہتا ہوں قاتل زندہ درگور ہو جائے' زندگی بھر جلتا تڑپتا رہے۔

خود وہ مرا تو بات ہی ختم ہو جائے گی۔"

"اچھا تمہارے ہاتھ میں دے دیں گے۔ مگر بیلہ کو ساتھ دینا پڑے گا۔ اس کی کمزوری خوبصورت عورت ہے۔"

سلمان اسقدر لاپرواہی سے وعدہ کر رہا تھا جیسے کسی چالاک اور محتاط انسان کو نہیں بلکہ انڈے سیتی کسی گھریلو مرغی کو گھیرنا ہو پڑوسی کے گھر میں۔

"پرسوں وہ دوبئی سے آئے گا۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے۔ خصوصی سوٹ کیس کی باڈی میں ہیروئن چھپا کر لے جاتا ہے۔ باقی کام میں کرلوں گا۔ اب مجھے بیعانہ دو۔ کوئٹہ سے پہلا سوٹ کیس لادو۔"

بس اڈے میدانِ حشر کا نظارہ پیش کرتے ہیں۔ اِدھر اُدھر بھاگتے لوگ، بدحواس پریشان حال سب کو اپنی پڑی تھی۔ کوئٹہ میں بس سٹینڈ پر رحمان کو سوٹ کیس ملا۔ سوٹ کیس ہاتھ آیا تو رحمان تھرتھرا اٹھا مگر اس نے اپنے ہاتھوں سے پہلو میں بنی ڈگی میں سوٹ کیس رکھا۔ پھر خدو نے دائیں بائیں اوپر مسافروں کا سامان بھر دیا۔ بار بار رحمان کا حلق خشک ہو جاتا۔ جس چیکنگ والے لشکر کو وہ ہمیشہ آنکھیں دکھایا کرتا تھا آج اس سے ڈر رہا تھا۔ جب معمول کے مطابق کسی چیکن پر کوچ روکا جاتا تو رحمان مضطرب ہو جاتا۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔

رات گئے کوسٹ گارڈ کا ناکہ جاگ رہا تھا۔ مسافر اتارے گئے۔ بعض بیگ اور سوٹ کیس چیک کیے گئے۔ رحمان کے سوٹ کیس تک چیکنگ والے نہ

پہنچے۔ سبزی منڈی میں سوٹ کیس لینے والا پہلے سے موجود تھا۔ وہ مسافروں میں گھل مل گیا۔ رحمان کے اشارے پر خدو نے اسے نہ روکا۔ وہ شخص سوٹ کیس اٹھا کر ہجوم میں کھو گیا۔ رحمان نے کراچی میں بیلہ کے نام کا خفیہ اکاؤنٹ کھلوا دیا تھا۔ رقم وہاں جمع کرا دی۔

اسی رات سلمان نے رحمان کے موبائل پر رابطہ کیا اسے بیلہ سمیت ایک ریسورنٹ میں اگلے روز دو بجے بلایا' یہاں سے وہ انہیں ایک فلیٹ میں لے گیا۔ اور جب فلیٹ سے باہر نکلے تو دونوں کو کوئی نہیں پہچان سکتا تھا۔ بیلہ کو وگ لگادی گئی تھی' وہ مکمل میک اپ میں تھی' سونے کے زیور اس نے پہلی بار پہنے تھے۔ پہلی بار وہ ایک خوبصورت لڑکی دکھائی دے رہی تھی۔ ورنہ تو وہ خود کو لڑکا ہی بنائے رکھتی۔ رحمان بھی اتنا بدل چکا تھا کہ شمروز بھی اسے نہ پہچان سکتا۔ وہ یورپ پلٹ ایک رئیس لگ رہا تھا۔ ہاتھ میں سگار تھا۔

منصوبے کے مطابق وہ ایک فائیوسٹار ہوٹل کے کمرے میں آ گئے' وہ کمرہ ان کے لیے جانے کس نے بک کر رکھا تھا۔ چپکے سے کمرے میں آ گئے۔ اس کے ساتھ کے کمرے میں قاتل کے بیٹے کو ٹھہرنا تھا۔ سلمان کا شیطانی دماغ تمام باریکیاں جان چکا تھا۔ جانے کہاں سے وہ اتنی معلومات لے لیا کرتا۔ بیلہ اور رحمان کسی دولت مند بزنس مین کے روپ میں تھے۔

انہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا اور پروگرام کے مطابق بیلہ نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ خلافِ توقع اس کے تین دوست بھی آ گئے تھے۔ شی واز ریگل

کی بوتل کھلی ہوئی تھی۔ بیلہ ٹھٹھک سی گئی۔ غنیمت تھا کہ حلیہ اسے سلمان بتلا چکا تھا۔ ورنہ وہ نہ پہچان پاتی۔ ''میں اکیلی تھی ساتھ کے کمرے میں سوچا کہ کمپنی مل جائے گی۔''

''آیئے نا۔ تشریف رکھیے۔'' سبھی احتراماً کھڑے ہوگئے۔ بیلہ کو بھی ایک پیگ پیش کیا۔ وہ اسے مہنگی کال گرل سمجھ رہے تھے۔

بیلہ نے جیسے تیسے زہر حلق سے اتارا۔

''آپ گروپ پسند نہیں کرتیں۔''

سوال ہوا۔

بیلہ کو پسینہ سا آ گیا۔

''جی نہیں ہم اگر آپ میرے کمرے میں آجائیں اکیلے۔''

اس نے دوستوں سے اجازت لی اور پیگ تھامے اس کے کمرے میں آ گیا۔ اس نے بیلہ کو بانہوں میں بھرنے کی کوشش کیں۔ ''ٹھہریئے پہلے دروازہ بند کرلو۔''

بیلہ نے دروازے کا ڈبل لاک لگا دیا۔

وہ اطمینان سے بیڈ پر آ بیٹھا۔ اسی لمحہ رحمان باہر نکلا اور اسے دبوچ لیا۔ اس نے پستول نکالنے کی کوشش کی مگر رحمان نے اسے گھونسوں پہ رکھ لیا۔ بیلہ نے کرسٹل کا وزنی گلدان دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر اس کے سر پہ دے مارا۔ اس کے سینے پر بیٹھ کر رحمان نے چاقو کھولا اور کاٹ کر رکھ دیا۔ ''دیکھو

زندہ تو نہیں۔"

بیلہ نے جلدی سے نبض ٹٹولی۔ دل چیک کیا۔

"نہیں مر چکا ہے۔" "بھاگو جلدی کرو۔"

رحمان نے اس خون آلود بال کاٹ کر جیب میں رکھ لیا۔ انہوں نے خون آلود ہاتھ دھوئے۔ جن پر باریک سے آپریشن گلوز چڑھے ہوئے تھے۔ تا کہ انگلیوں کے نشان نہ پکڑے جائیں۔وہ نہایت اطمینان سے باہر نکلے۔ بیلہ نے چادری اوڑھ رکھی تھی۔ سلیمان انہیں ویرانے میں لے گیا جہاں انہوں نے واردات میں استعمال ہونے والا سامان جلا کر اس کی راکھ سمندر میں بہا دی۔

اگلے روز اخبار چیخ اٹھے۔ شمروز کو ذرا تسلی سی ہوئی۔ مگر وہ اپنے محسن کا نام جاننا چاہتا تھا۔ اگرچہ اس کے ساتھی بدلہ لینا چاہتے تھے مگر انہیں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ سبھی حیران تھے کہ وہ کون ہوسکتا ہے۔ رحمان نے کوئی احسان نہیں کیا تھا۔ اپنی دانست میں یہ اس کا فرض تھا۔ لہٰذا اس نے اسے راز ہی رکھا۔ اور کچھ بھی نہ بولا۔ شمروز کے کریدنے پر بھی خاموش ہی رہا۔

بیلہ قتل کے بعد کانپتی رہتی۔ اسے اندھیرے میں ڈر لگتا۔ کبھی لگتا مقتول اندھیرے سے نکل کر سامنے آ کھڑا ہوگا۔ سوتے میں جاگ اٹھتی۔ سلمان بڑا فراخدل تھا۔ اس نے زیور واپس لینے سے انکار کردیا۔ بیلہ نے پھر بھی شکریہ ادا کرکے زیور رکھ لیے مگر ان سے خون کی بو آتی۔

رحمان دوبارہ اپنے روٹ پہ چلنے لگا تھا۔ باقاعدگی سے سلمان کے لیے ہیروئن لانے لگا۔ رحمان ٹوٹتا جا رہا تھا۔ بیلہ بھی مضطرب اور بیکل سی رہتی۔

رحمان نے خون آلود بالوں کو پلاسٹک میں بند کرکے کاغذوں میں لپیٹا اس کے اوپر اپنی بھدی تحریر میں لکھا ''سیٹھ! قتل کا بدلہ قتل۔ میں نے بدلہ لے لیا ہے۔'' اس نے احتیاط سے بادامی لفافہ بند کیا اور شمروز کے پاس رکھوا دیا۔

''سیٹھ زندگی کا بھروسہ نہیں۔ کتنے کوچ ڈرائیور میرے سامنے ایکسیڈنٹ میں مر گئے۔ میں نہ رہا تو یہ لفافہ کھول لینا۔تب تک یہ ایک امانت ہے۔''

''اللہ تمہیں سلامت رکھے۔ ایسی باتیں نہ کیا کرو۔'' شمروز بجھا بجھا سا رہتا تھا۔ بیٹے کی موت نے ایسے مضبوط انسان کو ریزہ ریزہ کردیا تھا۔

''سیٹھ جانتے ہو' قاتل کا بھی بیٹا مارا گیا۔''

''ہاں! مجھے زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔ قاتل اب تک زندہ ہے۔ میں اسے اپنے ہاتھوں قتل کروں گا۔''

ایک بار پھر وہ قاتل کی تلاش میں نکل پڑے۔

اس تک پہنچنا بہت مشکل تھا۔ مگر بیلہ کام آئی۔

سلمان نے ایک پرانے دلال کے ذریعے سودا کرا دیا۔ جس پر قاتل کو پورا پورا بھروسہ تھا۔ اور وہ بیلہ کے فلیٹ پہ آ گیا۔ یہ قیمتی فلیٹ اور انتظام بھی سلمان کا تھا۔ فلیٹ کے مالک یورپ گئے ہوئے تھے۔ سلمان نے دونوں چوکیداروں کو اغواء کرکے فلیٹ پر قبضہ کرلیا تھا۔

رحمان بھوکے بھیڑیئے کی طرح قاتل پر ٹوٹ پڑا۔ اسے خون میں نہلا دیا۔ رحمان نے اس کے بھی خون آلود بال کاٹے اور ساتھ لیتا گیا۔ دونوں وارداتوں میں مقتولین کے باڈی گارڈ اطمینان سے باہر گاڑیوں میں سگریٹ پیتے رہے گپ شپ لگاتے رہے۔

مقتول با اثر تھا۔ اخبار چیخ رہے تھے۔الیکٹرانک میڈیا احتجاج کر رہا تھا۔ اتنا تو سبھی جانتے تھے کہ شمروز بدلہ لے رہا ہے۔ مگر ثبوت نہ تھا۔ کسی قسم کا کوئی نشان بھی نہ ملا۔

رحمان نے پھر نیا لفافہ دیا' اور الفاظ دہرائے۔ شمروز نے وہ لفافہ بھی سیف میں بند کردیا جس کی چابی اس کے پاس رہا کرتی تھی۔ وہ بجھا بجھا سا رہا کرتا۔ رحمان سے چھیڑ چھاڑ بھی بند کر رکھی تھی۔

ہیروئن کا دھندا چل رہا تھا۔ مگر سلمان نے رقم سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ تکرار ہوئی تو سلمان نے بتایا کہ اس نے دونوں بار قتل کی خفیہ طور پر ویڈیو بنائی تھی۔

"اب میرے اشاروں پر چلتے رہو۔ ورنہ لٹک جاؤ گے۔ اور وہ ننھی سی جان بھی۔اس گڑیا کی جان تو بچالو پیارے۔"

ایک بار سلمان بیلہ سے ملنے بھی آیا۔"ایک ڈرائیور سے میں کہیں بہتر ہوں۔ اتنا روپیہ کما لوگی کہ ٹھاٹ سے رہو گی۔ سینیٹر بن جاتا۔ کسی نگران حکومت میں وزیر بنوا دیں گے۔یورپ کے چند ہی چکر لگانے پڑیں گے۔ میرا ہاتھ تھام لو۔"

"شکریہ" بیلہ نے خشک لہجے میں انکار کر دیا۔

"رحمان مجھ سے شادی کر چکا ہے۔ ہم نے مصلحتاً چھپا رکھا ہے۔ ایک شادی شدہ عورت سے ایسی باتیں آپ کو زیب نہیں دیتیں۔"

سلمان خوش دلی سے ہنسا۔ ''دلکش عورتیں کتنی صفائی سے جھوٹ بولتی ہیں۔ حسن اور جھوٹ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ شائد جھوٹ سے ہی حسن پیدا ہوا ہے۔ خیر سوچ لینا۔ ویسے جھوٹ بولتی تم اور بھی پیاری لگتی ہو۔''

حالات رحمان کے قابو سے باہر ہو رہے تھے۔ اس کے اعصاب جواب دیتے جا رہے تھے۔ روز روز اسے پل صراط سے گزرنا پڑتا۔ سلیمان کی مسلسل بلیک میلنگ اور خوف سے گھبرا کر وہ ہیروئن پینے لگا۔ بیلہ بھی کانپتی رہتی۔ اسے سلمان کی بلیک میلنگ کا پتہ چلتا تو شائد خوف سے ہی مر جاتی۔ مگر اس نے رحمان کو مشورہ دیا کہ انہیں یہ علاقہ فوراً چھوڑ کر رو پوش ہو جانا چاہیے۔ کچھ عرصے کے لیے ہی سہی۔ یا پھر وہ شمروز کو پوری کہانی سنا دے۔

''میں اب کلینک چلا سکتی ہوں۔ پنجاب کے کسی قصبے میں چلے جائیں گے، دوسرے صوبوں میں تمہیں کون جانتا ہے اور کلینک چلا کر کے میں گھر چلاتی رہوں گی۔ تم نے جو میرا اکاؤنٹ کھول کر بے تحاشہ دولت سلیمان والی جمع کی ہے وہ بھی تو ہمارے پاس ہے۔''

رحمان بالکل نہ مانا وہ شمروز کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا حالانکہ خدشہ تھا کہ اگر رحمان ہیروئن لے جاتا ہوا دھر لیا گیا تو شمروز کی کس قدر بدنامی ہوگی۔ پوری کمپنی بدنام ہو جائے گی۔ صورتحال ایسی تھی کہ کامریڈ سے بھی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ذہنی سکون کی گولیاں کھانے سے رحمان کے جسمانی Reflexes کمزور پڑتے جا رہے تھے۔ کسی بھی ڈرائیور کے لیے یہ سب کچھ

خطرناک ہوتا۔ خصوصاً رحمان جو سواریوں کو امانت سمجھ کر لے جایا کرتا تھا۔ خدو سب کچھ بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کئی ایک بار کریدنا چاہا۔ مگر رحمان اس موضوع پر گفتگو کے لیے تیار نہ ہوتا۔ اس کی بدلتی ہوئی عادتوں اور طور و اطوار کو پہلے تو شمروز نے محبت کا جذباتی بحران سمجھ کر نظر انداز کردیا۔ مگر پھر اسے شک سا گزرنے لگا۔

بیلہ اور رحمان ڈرے سہمے رہتے۔ مستقبل کے منصوبے بناتے کہ پنجاب کے کسی دور افتادہ علاقے میں روپوش ہو جائیں یا پھر شمروز کو سب کچھ بتا کر اس کی مدد طلب کی جائے۔ رحمان نہیں چاہتا تھا کہ اخلاقی گراوٹ کی خبر شمروز تک پہنچ پائے۔ ہیرو سے زیرو بننے کا تصور ہی ہولناک تھا۔ اتنی بڑی بس سروس چلانے والا پوری معلومات حاصل کرتا رہتا تھا۔ اس کا اپنا ایک اندرونی نظام تھا جو اسے باخبر رکھتا۔ اس کے انفارمر پہلے تو ہچکچاتے رہے۔ مگر پھر اشارہ کر ہی دیا۔شمروز کے کانوں تک بھنک پہنچی کہ رحمان ہیروئن لے جاتا ہے تو اس نے ڈرائیوری سے اسے ہٹا دیا۔ یہ سب کچھ اچانک ہوگیا۔ کوئٹہ پہنچتے ہی اس سے چابی چھین لی گئی۔ ''دفتر میں رہو۔ ٹائم کیپر کا کام کرو۔ دفتر کا اکاؤنٹ سنبھالو۔''

رحمان پر بجلی گر پڑی۔''میں ڈرائیور ہوں۔ ڈرائیوری میری زندگی ہے۔ دفتر میں تو میں مر جاؤں گا۔''

''تم اس معمولی سی لڑکی بیلہ کے لیے سب کچھ کر رہے ہو۔ اب تم

کبھی کوچ نہیں چلا سکتے۔ مجھ سے روپیہ مانگ لیتے۔کتنا روپیہ چاہیے تھا اس لڑکی کو؟ محبت کیا تم روپے سے خریدنا چاہتے تھے۔"

رحمان نشے میں تھا۔کوچ سے اترتے ہی گولیاں پھانک گیا تھا۔

"کیا ہے میری زندگی میں؟ کیا ملا بچپن سے نہ ماں نہ باپ۔ در در کی ٹھوکریں، تم مجھ سے کوچ بھی چھین لینا چاہتے ہو۔"

شمروز بدستور غصے میں تھا۔"تم ڈرگ مافیا سے جا ملے ہو۔ ہیروئن کا کاروبار کرنے لگے ہو۔ روپیہ چاہیے تھا۔ مجھ سے لے لیتے۔"

ہیروئن کے ساتھ ساتھ رحمان نشہ آور گولیاں کچھ زیادہ ہی کھانے لگا تھا۔

چرس تو بڑا ہلکا سا سرور دیتی ہے، بے خودی نہیں دیتی۔یہاں کون کافر ہوش میں رہنا چاہتا تھا۔

بیلہ کی چابی چھین کر شمروز نے میز پر رکھ لی تھی۔ رحمان نے زبردستی اٹھالی۔"یہ کوچ نہیں میری جان ہے۔ میں بیلہ کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ میں ڈرائیوری کروں گا۔ میں جیوں گا ڈرائیور بن کر، مروں گا ڈرائیور بن کر۔"

شمروز کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔ وہ آگ بگولہ ہو رہا تھا۔ "تمہاری دادی نے مرتے دم مجھ سے قرآن پر عہد لیا تھا، کہ میں زندگی بھر تمہاری حفاظت کروں گا۔ ایک عظیم انقلابی کے بیٹے اتنا گر جاؤ گے میں نے سوچا بھی نہ تھا۔"

رحمان ہوش میں کب تھا ''میری دادی مر چکی ہے۔ تم کس وعدے کی بات کر رہے ہو۔''

شمروز نے لپک کر بائیں ہاتھ سے رحمان کا گریبان پکڑ کر دائیں ہاتھ کا فولادی مکہ تان لیا۔ کچھ دیر وہ کانپتا رہا پھر اس نے رحمان کو صوفے پر دھکیل دیا۔ تنا ہوا مکہ اپنی میز پر اس زور سے مارا کہ شیشہ ٹوٹ گیا، میز کا وہ حصہ پچک گیا۔

''یہ ایک براہوی کا وعدہ ہے میں زندگی بھر اس پر قائم رہوں گا اور مرتے ہوئے بیٹوں سے کہتا جاؤں گا کہ وہ میرا وعدہ نبھائیں۔ اگر مرنے سے وعدے ختم ہوتے تو دنیا مٹ جاتی۔ سارے مندروں اور مسجدوں کو تالے لگ جاتے، چرچ بند ہو جاتے۔اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی بھی ہے۔تم سے تو قلات اور نوشکی کے ہندو ہی اچھے جو کرم یوگ مانتے ہیں۔''

رحمان دلیری سے بولا ''میں نے جو کچھ ٹھیک ہی کیا۔ مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔''

شمروز کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے پانی پیا اور اپنے آپ پر قابو پانے لگا۔ اس کا سانس دھونکی کی طرح چل رہا تھا۔

رحمان نے چھینی ہوئی چابی دوبارہ حاصل کرنے کے لیے شمروز کے ہاتھ پہ ہاتھ مارا۔ اچانک شمروز اٹھا۔ اس نے چابی چھین لی۔ مسلح محافظ پوزیشن لے کر کھڑے ہوگئے۔ ایک محافظ نے رحمان کو گریباں سے پکڑ لیا۔

''تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟'' شمروز محافظ پر ٹوٹ پڑا۔ ''تم نے میرے بیٹے کے گریبان پر ہاتھ ڈالا۔ توڑ دوں گا میں یہ ہاتھ۔''

شمروز نے گارڈ اس سے آگے بڑھ کر بندوق چھین لی اور اسے بٹ مارنے لگا۔ محافظ زمین پر گر کر بلبلانے لگا۔ شمروز نے ایک دو ٹھوکریں بھی محافظ کو رسید کیں۔ پھر رحمان کو پکڑ کر ساتھ کے کمرے میں بند کر دیا۔

''اس کے کھانے پینے کا خیال رکھنا۔ دروازہ مت کھولنا۔ کھڑکی سے سب کچھ دینا۔ کل اسے ہسپتال میں داخل کرا دیں گے۔ خبردار کسی سے رحمان کی حالت کا ذکر نہ کرنا۔''

شمروز نے ملازموں کو سختی سے تاکید کی۔ پیشانی پہ بل پڑے ہوئے تھے اور غصے میں اپنے گارڈ لے کر باہر نکل گیا۔ بیلہ کی چابی بدستور میز کے شیشے پر پڑی ہوئی تھی۔

خدو اندھیرے میں ڈوبے کوچ میں جا بیٹھا۔ کچھ دیر دھاڑیں مار مار کے روتا رہا۔ پھر اپنے آنسو خود ہی پونچھے اور کوچ کے اندر ٹانگیں سمیٹ کر گھٹنے پیٹ سے لگا کر راہداری میں لیٹ گیا۔

نیند آنکھوں سے کراچی جتنی دور تھی۔ کافی دیر کے بعد خدو کو خیال آیا کہ بیلہ سے مدد لینی چاہیے۔ دفتر مقفل تھا۔ وہ کسی پبلک کال آفس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ بیلہ وارڈ میں تھی مل نہیں رہی تھی۔ خدو کال پہ کال کیے جا رہا تھا۔ پبلک کال آفس والا اجنبی تھا۔ خدو کے پاس پیسے ختم ہو چکے تھے۔ اس نے

اپنے گلے سے سونے کی زنجیر اتار کر گروی کر دی' چند سال پہلے اسے رحمان نے یہ زنجیر دی تھی۔ کال پہ کال تھی۔ آخر بیلہ اسے مل ہی گئی۔ خدو نے اسے جلدی جلدی پوری کہانی سنائی۔

''جلدی آ جاؤ بیلہ۔ استاد پاگل ہو گیا۔''

''میں پہلے کوچ سے آ جاؤں گی۔ سیٹھ شمروز کا نمبر دو۔''

شمروز گھر نہیں پہنچا تھا۔ وہ ڈاکٹروں سے مشورہ کرتا پھر رہا تھا کہ رحمان، کا کہاں علاج بہتر رہے گا۔ اس بات پہ اتفاق ہوا کہ فوری طور پر بیرونِ ملک علاج کے لیے بھجوا دیا جائے۔

رحمان کے ہوش ٹھکانے آئے تو اس نے دیکھا میز پر فون پڑا ہے۔ اس نے سلمان کو فون کیا۔ ''تم کہاں ہو؟ فوراً آ جاؤ۔ ایک کروڑ کا بزنس ہے' میں سیٹھ شمروز کے دفتر میں بول رہا ہوں۔''

''بڑے خوش قسمت ہو تم۔ میں اتفاقاً کوئٹہ ہی میں ہوں' کوئی ٹریپ تو نہیں۔''

''نہیں۔ سیف میں ایک کروڑ روپیہ پڑا ہے۔ اگر تم سیف توڑنے کا سامان لے آؤ تو آدھا آدھا کرلیں گے۔ میں دفتر ہی سے بول رہا ہوں۔ ڈاکٹر بن کر آنا۔ مجھے علاج کے لیے دفتر میں ہی بند کر دیا گیا ہے۔''

''ہاں درست کہتے ہو تمہارا نمبر موبائل پر آ رہا ہے۔ سیف تو گیس سے بھی کاٹا جا سکتا ہے۔ چھوٹا سا سلنڈر ہی کافی ہے۔''

رحمان کو سکون سا ملا۔ ''رات دو بجے کے بعد جب سب سو جائیں گے۔ میرے دفتر کی بتی جل رہی ہوگی اور ہاں میرے لیے ایک اعلیٰ پستول بھی لانا۔ فرار ہونے کے لیے اسلحہ چاہیے۔''

''لیتا آؤں گا۔'' سلمان بھی خوش تھا۔ ایک کروڑ مفت میں۔ رحمان کو تو وہ ٹھکانے لگا دیتا۔ چوری بھی رحمان کے ہی کھاتے میں ڈال دیتا۔

بیلہ کالیں کرتی ہار گئی۔ مگر سیٹھ شمروز نہ ملا۔ کارڈ ختم ہو چکا تھا۔ وارڈ سے باہر کے نمبروں پر فون نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ ایک معمر وارڈ بوائے کو لے کر باہر گیٹ پر پبلک کال آفس چلی گئی۔ رات بین کر رہی تھی۔

"لے کے رہیں کے پاکستان" والوں کا شہر خوف کے اندھیروں میں سو رہا تھا۔ تالے' آہنی گیٹ' لوہے کی گرل والے فلیٹوں میں سہمے ڈرے خاندان شاید بھیانک خواب دیکھ رہے تھے۔ عمر قید' زندگی بھر کا عقوبت خانہ' سمندری ہوائیں جل پریوں کے دیس سے لشکر بہ لشکر آ آ کر انہیں دیکھ رہی تھیں۔

پہلے تو کوئی شمروز کو بلانے پر رضامند ہی نہ ہوا۔ بڑی مشکلوں سے جب واسطے دے دے کر بلک بلک کر بیلہ نے کہا کہ وہ رحمان والی بیلہ ہے۔

موت اور زندگی کا سوال ہے تو شمروز کو پیغام دیا گیا۔ وہ اب تک جاگ رہا تھا۔ دیوار پہ نظریں جھکائے چپ چاپ لیٹا تھا۔ بیلہ کے نام پر اس نے نفرت سے سر جھٹکا اور اشارے سے کہا فون بند کر دیا جائے۔ شمروز کے خادم کا دل پسیج چکا تھا۔ ''اللہ اور رسول کے واسطے دے رہی ہے۔ رو رہی ہے۔ دو کانی بابا پیر لیٹو، شیر جان آغا، بی نانی، خواجہ ابرہیم یکپاسی کی قسمیں بھی دے رہی ہے۔'' خادم مذہبی انسان تھا۔

اتنی بڑی قسموں سے گھبرا کر شمروز اٹھ بیٹھا۔ ساتھ کے کمرے میں فون پر بیلہ سے مخاطب ہوا۔ بیلہ روئے جا رہی تھی۔ ''سیٹھ بدلہ رحمان نے لیا ہے۔ آپ وہ لفافے کھول کر پڑھ لیں۔ رحمان آپ پر قربان ہوگیا ہے۔ دیکھیں لفافے میں کیا ہے۔'' شمروز کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ قاتل اور قاتل کے بیٹے کو مارنے والا شخص رحمان ہے۔ رحمان ہی نے تو کہا تھا کہ وہ بدلہ لیے بغیر سامنے نہیں آئے گا۔ پھر اچانک ساتھ بیٹھ کر چائے بھی پینے لگا تھا۔ قتل رحمان نے کیے اپنے ہاتھوں سے۔ وعدے کے مطابق۔ شمروز ہکا بکا رہ گیا۔ اس کے ہاتھ سے ریسیور گرتے گرتے بچا۔

''بیلہ تم فوراً آ جاؤ۔''

''میں پہلے کوچ سے آ جاؤں گی۔''

''نہیں کراچی کا منشی کار بھجوا دے گا۔ تم ہمارے ڈرائیوروں کو پہچانتی ہو۔ ساتھ ایک گن مین بھی ہوگا۔ کب آ سکتی ہو۔''

''ابھی اسی وقت۔'' اس نے جلدی جلدی وارڈ کا پتہ لکھوایا۔ شمروز نے کراچی فون کر کے حکم دیا کہ فوراً کار میں بیلہ کو پہنچا دیا جائے۔ ''فوراً کہیں نہ روکنا فوراً آؤ۔ گولی کی طرح آؤ۔''

وارڈ بوائے پریشان تھا۔ ''خیر تو ہے ڈاکٹر صاحب۔ آپ کیوں رو رہی ہیں۔''

''ہاں خیر ہی ہے۔'' بیلہ نے واش روم میں پانی کے چھینٹے مارے۔ لیکن آنکھیں بدستور بھیگی بھیگی، بوجھل بوجھل سی رہیں۔

اس نے جلدی جلدی ہلکا سا میک اپ کیا اور جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

اپنے تعلقات کے سبب شمروز نے وزیر داخلہ کو جگایا اور فون پر کہا کہ اس کے کل ہی رحمان اور بیلہ کے لیے پاسپورٹ چاہیے۔ وہ بیلہ کا اصل نام نہیں جانتا تھا۔ ویزا بھی چاہیے۔ وزیر داخلہ ہنس پڑا ''میں تو ڈر ہی گیا تھا کہ جانے کیا ایمرجنسی ہے۔ یہ تو ہو جائے گا، آپ بے فکر رہیں۔''

شمروز کے دل میں دوبارہ رحمان کے لیے جگہ ہو گئی۔ لفافے وہ گھر میں محفوظ کر چکا تھا۔ اس نے سیف سے لفافے نکال کر چاک کر لیے۔ دشمنوں کے خون آلود بال دیکھ کر اسے سکون ملا۔ رحمان نے اتنے عیار اتنے طاقتور دشمن کو کیسے گھیرے میں لیا۔ مارا کیسے۔ جبکہ شمروز کے اپنے لوگ ان کی گرد کو نہ پہنچ سکے تھے۔ رحمان یقیناً اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اور بتایا جانا شائد وہ مناسب نہ سمجھ رہا تھا۔ کیونکہ یوں لگتا کہ اس نے کوئی احسان کیا ہے۔ مگر ایسا سب کچھ کیوں ہوا۔ شمروز کو تاسف بھی ہوا کہ وہ اب تک رحمان کے کردار کی عظمت جان نہ سکا۔

رحمان نے پانی مانگا جو اسے دے دیا گیا۔ اس نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے ''یااللہ مجھے اتنی طاقت دے کہ میں ایک شیطان کو ہلاک کر دوں۔ خواجہ ابراہیم یکپاسی میری روحانی مدد فرما۔'' وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگتا چلا گیا۔ وہ اپنی طاقت مجتمع کرتا رہا۔ اس نے کھانے کو بھی مانگا جو اسے دے دیا گیا۔چائے پی کر بھی وہ دعائیں مانگتا چلا گیا۔ اس نے باپ کی روح سے مدد مانگی۔ چچا کا چہرہ نظروں میں لایا۔ وہ ذہنی انتشار کو ایک جنگ کے لیے مجتمع کرتا رہا۔ محافظ کچھ خوفزدہ تھے کسی نے کچھ نہ پوچھا۔

سلمان دو بجے آ گیا۔ایمبولینس پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور بھی تھے۔ انہوں نے سفید اوورآل پہنے ہوئے تھے۔ تکمانہ

انداز میں کہا۔

''ہم ڈاکٹر ہیں۔ سیٹھ شمروز نے ہمیں بھجوایا ہے۔ مریض کہاں ہے؟''

ملازم ڈر رہے تھے۔ مگر پھر بھی انہوں نے ڈرتے ڈرتے رحمان کا کمرہ کھول دیا۔ ''سیٹھ سے اجازت لے لی ہے؟''

جواب ملا ''سیٹھ ہی نے تو بھجوایا ہے۔''

''ویسے سیٹھ کا حکم ہے کمرہ نہ کھولا جائے۔''

سلمان ملازموں پہ برس پڑا۔ ''پھر ہم علاج کیسے کریں گے' جاؤ گرم پانی کا انتظام کرو۔ چائے بھی بناؤ اور یہ پرچی والی دوائیاں فوراً منگواؤ۔''

بدحواس ملازم ادھر ادھر بکھر گئے۔ رحمان اٹھ بیٹھا۔

''سیف کہاں ہے؟'' سلمان نے سوال کیا۔

''میرا پستول کہاں ہے؟''

''یہ لو پستول گلاک 17 کیا یاد کرو گے سولہ گولیاں ہیں' نائن ایم ایم کی **Full Metal Jacket** دیوار سے بھی گزر جائیں گی۔''

رحمان نے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں پستول لیا۔ میگزین دیکھا' پستول لوڈ کیا۔ اور چند قدم پیچھے ہٹ کر فائر کرنے لگا۔ سلمان کے دونوں ساتھی ڈھیر ہوگئے' دو گولیاں سلمان کے پیٹ میں اتر گئیں' ایک بازو میں سے نکل گئی۔

سلیمان زمین پہ تڑپتا زندگی کے لیے بلبلانے لگا ''ان دونوں کو مارنے کے لیے میں نے ڈرگ مافیا سے روپیہ لیا تھا۔ استعمال تم ہوئے مجھے معاف کر

دو مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی' شمروز سے مجھے ملوا دو۔ وعدہ ہے میں وہ رقم واپس کردوں گا۔'' رحمان سخت اور سنگدل ہو چکا تھا۔ اس انکشاف پر مزید سیخ پا ہوا۔ ''اور ہیروئن کے پیسے؟'' سلمان زندگی کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ ''وہ بھی واپس کردوں گا۔ کل ہی دے دوں گا۔''

''اور تم نے ویڈیو جو بنائی تھی۔'' سلمان قسمیں کھانے لگا کہ اس نے کوئی وڈیو نہیں بنائی۔وہ تو محض بلیک میل کرنے کا ایک طریقہ تھا۔ رحمان نے اطمینان سے سگریٹ سلگایا۔ ملازم زور زور سے دروازہ پیٹ رہے تھے' آوازیں دے رہے تھے۔

''رحمان میں گواہی نہیں دوں گا' یہ دونوں مر گئے تو مر گئے۔ اگر تم نے مجھے مارا تو بیلہ کا کیا بنے گا؟ اتنا روپیہ دوں گا کہ عیش کرو گے۔ فون کرکے ڈاکٹر کو بلالو۔ مجھے بچالو میری زبان بند رہے گی۔'' رحمان نے ڈانٹا۔ ''اگر خاموش نہ ہوئے تو زبان بند کردوں گا۔ میں تمہیں آہستہ آہستہ مرتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔ دعا کرو کہ شمروز یا پولیس آ کر تمہیں بچالے۔''

رحمان نے کراچی فون کیا تو ہسپتال کے وارڈ سے پتہ چلا کہ بیلہ روتی دھوتی ڈیوٹی سے آف ہوگئی ہے۔ وہی وارڈ بوائے تھا فون پر ''رحمان تم فوراً آجاؤ' پتہ نہیں کیا بات ہے' روئے جا رہی تھی۔ کوئی خاص بات ہے فوراً آجاؤ۔''

رحمان نے ہاسٹل فون کیا تو علم ہوا کہ بیلہ وہاں بھی نہیں پہنچی۔ اتنی رات گئے بیلہ کہاں جاسکتی ہے۔ سلمان نزع کے عالم میں تھا۔ ''رحمان مجھے

معاف کردو، بہت دولت دوں گا۔ مجھے بچالو۔" وہ گھگھیا رہا تھا۔

رحمان اسے دیکھتا رہا۔ اُس کے دل میں نفرت تھی۔ اس نے دو شعلے سلمان کے سر میں اتار دیئے۔ پھر وہ باہر نکلا۔ میز پہ پڑی چابی اس نے اٹھائی اور باہر لپکا۔ پستول بدستور اس کے ہاتھ میں تھا ملازم شمروز کے سابقہ رویئے سے خوفزدہ تھے، وہ رحمان کو ہاتھ نہیں لگانا چاہتے تھے۔ نہ ہی مداخلت کرنا چاہتے تھے۔

رحمان نے کوچ سٹارٹ کیا تو خدو جاگ اٹھا۔ رحمان نے پستول سے خدو کو باہر نکل جانے کا حکم دیا۔ خدو باہر نکل کر ٹائر کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"مجھے ساتھ لے جاؤ یا میرے اوپر سے ٹائر گزاردو۔ میں نہیں ہٹوں گا استاد۔ میں تمہارے لیے جان دے دوں گا۔"

خدو راستہ روکے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں کا عزم بتلا رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے سچ ہی کہہ رہا ہے۔ وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا۔ وہ چٹان کی طرح جم گیا۔ اس کے اندر کا براہوی جاگ اٹھا تھا۔ وہ ناقابلِ تسخیر ہو چکا تھا۔

"تم اکیلے کیسے لڑو گے استاد! تمہیں میری ضرورت ہے، استاد میں تمہارے لیے جان دے دوں گا مجھے ساتھ لے چلو استاد۔" رحمان ہینڈ بریک کھینچ کر نیچے اتر آیا۔ اس نے خدو کو گلے سے لگالیا۔

خدو تڑپ اٹھا "مجھے بھی ساتھ لے جاؤ استاد۔"

وہ اس کے قدموں پر گر پڑا۔

''دنیا میں تمہارے سوا میرا کوئی نہیں ہے۔ اکیلے نہ جاؤ استاد! میں تمہارا بازو ہوں۔''

''نہیں خدو مجھے بہت دور جانا ہے۔ اکیلے جانا ہے۔ وقت کم ہے تمہیں میری قسم ہے ہٹ جاؤ۔ تمہیں قسم ہے میری جان کی قسم ہے سامنے سے ہٹ جاؤ ورنہ میں خود کو گولی مار لوں گا۔''

اتنی بڑی قسم پر خدو ہٹ گیا' بیلہ گرجتا ہوا آگے بڑھا۔ مگر اچانک بریک لگے۔ کوچ بند ہوگیا۔ اس نے کوچ کی چابی خدو کو دے دی۔

''سیٹھ سے کہنا کہ اس کوچ کو صرف خدو چلائے گا۔ یہ پستول سلیمان کے پاس پھینک دینا۔''

بدحواس ملازمین پھٹی پھٹی نظروں سے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ ''پہلے چابی سیٹھ کی میز پر رکھ دینا۔'' رحمان نے سلیمان کی لینڈ کروزینگ سٹارٹ کی' چابی اندر ہی تھی۔ وہ طوفانی رفتار سے نکل گیا۔ اس کا رخ لکپاس کی جانب تھا۔ ٹائر چرچرا رہے تھے۔ وہ دیوانہ وار ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ گاڑی اڑی جا رہی تھی۔

اس سے سالہاسال اس روٹ پر گاڑی چلائی تھی' ایک ایک موڑ ایک ایک جمپ اسے یاد تھا۔

......❁......

خدو سینہ تان کر کھڑا ہوگیا اور چلتا ہوا دفتر میں لاشوں کے پاس کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اطمینان سے سگریٹ پینے لگا۔ ''انہیں میں نے قتل کیا ہے۔ خبردار استاد کا نام نہ لینا ''مقتولوں کے لیے بنی ہوئی چائے منگوائی اور نہایت لاپرواہی سے چائے پینے لگا۔ ''خدو تمہیں پھانسی نہ ہو جائے۔'' ایک ہمدرد گھبرایا۔ ''ہو جانے دو یہ کون سی بڑی بات ہے۔''

محافظوں کے ہوش و حواس بجا ہوئے تو انہوں نے شمروز کو پتا سنائی۔

شمروز مضبوط اعصاب کا انسان تھا۔

''ٹھیک ہے' فون خالی رکھنا ابھی بتاتا ہوں۔''

فون کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے بدحواسی میں فون اٹھایا۔شمروز بول رہا تھا۔ ''پولیس کو بتانا کہ ڈاکو آئے تھے خدو لوگوں نے مار دیا۔ دفتر میں اِدھر اُدھر

بھی گولیاں چلا دینا۔ سارے فون استعمال کرو۔ جب تک اپنے لوگوں کو بتا دو کہ نیلی لینڈ کروزینگ میں رحمان نکل گیا ہے۔ اسے ہر قیمت پر روکنا ہے۔ جہاں ملے روکنا ہے۔ جو اسے روکے گا اسے میں پچاس ہزار روپیہ انعام دوں گا اور ہاں! پولیس تک یہ خبر نہ پہنچ پائے۔ رحمان کا بالکل ذکر نہ آنے پائے۔"

پولیس اور علاقہ مجسٹریٹ پہنچ چکے تھے۔ پولیس نے ضابطے کی کارروائی کی۔ لاشوں کی تصویریں بنائیں۔ خدو کو ایک پستول پکڑا دیا گیا۔ وہ اس نے پولیس کے حوالے کر دیا۔

"تم نے انہیں قتل کیا ہے؟" مجسٹریٹ نے دفعہ 144 کا بیان لیا۔ خدو نے اقبالی بیان دیا۔

"یہ ڈاکو ہیں، سیف توڑ رہے تھے، میرے للکارنے پر مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا۔ میں نے جان بچانے کے لیے فائرنگ کر دی۔"

مجسٹریٹ نے سوال کیا "تم ٹانگوں میں بھی تو گولیاں مار سکتے تھے۔ تم نے ان کی کھوپڑیاں ہی اڑا دیں۔"

"جناب میں کوئی ٹرینڈ نشانچی نہیں ہوں۔ مجھے کیا پتہ کہ گولیاں کہاں پڑیں گی۔"

"تم بغیر خوف اور دباؤ کے یہ بیان دے رہے ہو۔" "جی ہاں" خودو نے بے خوفی سے جواب دیا۔ ہتھکڑیاں لگا کر خدو کو پولیس ساتھ لے گئی۔ اتنے میں شمروز بھی آ چکا تھا۔ ایس ایچ او کے علاوہ مجسٹریٹ بھی اس کے دفتر میں

بیٹھے تھے۔

دروازے بند تھے۔

''اتنے پیسے دوں گا کہ یاد کرو گے۔ خدو پر کوئی الزام نہ آئے۔''

ایس ایچ نے فخر سے اعلان کیا ''میر صاحب تیس سال میری نوکری ہے۔ ایسا کیس بناؤں گا کہ آپ واقعی میری قدر کریں گے۔''

''آپ صاحبان کی قدر میں ہمیشہ ہی کرتا ہوں۔'' شمروز نے سیف سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر انہیں پیش کیں۔ جن پر وہ بھوکے گدھوں کی مانند ٹوٹ پڑے۔ لحہ بھر میں ان کے لباس نوٹ نگل گیا۔

''یہ پہلی قسط ہے۔'' شمروز نے ان کی للچائی ہوئی آنکھیں دیکھ کر حقارت سے کہا۔ اسے لگا وہ قلات کے ہوٹل کے باہر دم ہلاتے پلّوں کو ہڈیاں پھینک رہا ہے۔

کچھ دیر بعد وہ عملے سمیت اکیلا رہ گیا۔ اور رحمان کو روکنے کا حکم دیا۔

''اسے روک لو۔ اور پکڑ کر میرے پاس لاؤ۔ مدافعت کرے تو ہاتھ پاؤں باندھ کر لے آنا۔''

قلات سے حب تک ٹیلی فونوں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ رات جاگ اٹھی تھی، خضدار میں کمپنی کا کوچ فوری طور پر خالی کرا کے عین سڑک کے درمیان دیوار کی طرح کھڑا کر دیا گیا، مگر آندھی اور طوفان کی طرح آتی ہوئی گاڑی سڑک سے پھسلی، کچے میں اتری اور دوبارہ سڑک پر آ گئی۔ مجمع منہ دیکھتا

ہی رہ گیا۔

پچاس کلومیٹر آگے کمپنی کے کراچی سے آنے والے دو کوچ ٹینکوں کی طرح سڑک پکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ ہیڈ لائیٹیں آن تھیں۔ مسافر اِدھر اُدھر جا چھپے کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ دور سے لینڈ کروزینگ نموار ہوئی۔ اس کی ہیڈ لائیٹس اور انڈی کیٹرز آن تھے۔ جوں ہی روڈ بلاک پایا۔ بائیں طرف سے ایک پرانے Diversion کے پتھر اڑاتی ہوئی پہلو سے نکل گئی۔ ڈرائیوروں کو رحمان سے ہمدردی بھی تھی اور پچاس ہزار روپیہ ہاتھ سے نکل جانے کا افسوس بھی تھا۔ لیکن مسافروں نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔ اودھر شمروز نہیں چاہتا تھا کہ بات زنجیر والوں تک پہنچے۔ اس لیے زنجیر والے رحمان کو پہچان کر جھٹ زنجیر گرا دیا کرتے تھے۔ رحمان نے منوا لیا کہ وہ واقعتاً ہی کنگ آف دی روڈ ہے۔ کوئی اسے کسی طرح بھی نہ روک سکا ساری تدبیریں ناکام ہوتی جارہی تھیں۔ اب وہ میدانی علاقے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ جس کے بعد اسے ڈھونڈھنا محال تھا۔ لیاری کے مکرانی اس کے دوست تھے وہ اسے کسی بھی ملک میں غائب کر دیتے۔ رحمت سالاڑیں شکاری نے فون پر شمروز سے فائرنگ کی اجازت لے لی۔ اور جونہی رحمان اس کے علاقے میں داخل ہوا۔ رحمت نے پچھلے دونوں ٹائر دھماکے سے اڑا دیئے دو سو بائیس بور کی نوکدار گولیاں تباہ کن ثابت ہوئیں۔ لیکن رحمت اور اس کے ساتھی ششدر رہ گئے کہ گاڑی RIMS پر گھسٹتی ہوئی آگے بڑھتی ہوئی غیر معروف راستوں کی جانب مڑ گئی اور ٹیلوں میں غائب ہوگئی۔ رحمان نے اصل سڑک چھوڑ دی تھی۔

رحمان کی تلاش جاری رہی۔ دو روز بعد لینڈ کروزنگ غیر معروف راستے پر بھورے پہاڑوں میں مل گئی۔ ونڈ سکرین ریزہ ریزہ ہو چکا تھا۔ سٹیرنگ وہیل تک ٹیڑھا ہو چکا تھا۔ گاڑی بلندی سے لڑکھڑاتی ڈگماتی نیچے چٹان سے آ ٹکرائی تھی۔ سٹیرنگ اور سیٹ پر خون کے پرانے دھبے تھے۔ رحمان غائب تھا۔ آس پاس آبادی نہیں تھی۔ ریت کے طوفانوں نے نشان بھی مٹا دیئے تھے۔ شمروز نے کھوجی منگوا لیے مگر وہ بھی قدموں کے نشان نہ اٹھا سکے۔

کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ رحمان وحشی جانوروں کا نوالہ بن گیا۔ بعض کا خیال تھا کہ ساربانوں نے یا چرواہوں نے اس کی لاش دفن کر دی ہوگی۔ اور اپنے سفر پر آگے نکل گئے ہوں گے۔ شمروز مایوس ہونے والا یا ہمت ہارنے والا شخص نہ تھا۔ اس نے اخباروں میں اشتہار دلوا دیئے' تصویر بھی لگوا دی کہ رحمان کو زندہ یا مردہ تلاش کرنے والے کو پانچ لاکھ روپیہ نقد انعام دیا جائے گا۔ اس کے لوگ ساربانوں سے ملتے رہے تلاش کرتے رہے۔ شمروز ہار مارنے والا انسان نہ تھا۔ وہ انعامی رقم بڑھاتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ انعام تیس لاکھ تک جا پہنچا۔ کئی قسمت آزماء تلاش میں جتے رہے۔ جیل میں رہنے سے خدو خاصا موٹا ہوگیا تھا۔ دو ماہ بعد ضمانت پہ رہا ہوگیا۔

''کافی موٹے ہو گئے ہو، تمہیں جیل میں کیوں نہ ڈالوا دوں گا۔ اتنی اچھی صحت بنی ہے۔'' شمروز نے مذاقاً کہا۔ غم کی بھٹی میں جلتے رہنے کے بعد وہ کندن بن چکا تھا۔

''سیٹھ۔ کھانا دفتر سے آتا تھا، ورنہ جیل کی دال کھا کر تو میں ڈھانچہ بن جاتا۔''

''تمہیں جوتے لگاؤں یا انعام دوں۔'' شمروز نے پوچھا۔

''مجھے جوتے لگاؤ۔ بڑے خوبصورت ہیں، دل چاہتا ہے تم مسجد میں نماز پڑھنے جاؤ تو میں چرالوں۔''

شمروز نے مکہ تان لیا ''خدو دنیا بدل جائے گی تم نہیں ٹھیک ہو سکتے۔ اچھا یہ لو میری طرف سے تحفہ''اس نے دراز سے چابی نکال کر خدو پہ پھینک دی۔ جو خدو نے مہارت سے اچک لی۔

''بیلہ کوچ اب تمہارا ہے۔ اس پر بیلہ کی بجائے رحمان لکھوا لو۔''

''اب میں اسے چلایا کروں۔'' خدو نے خوشی سے پوچھا''یہ تو میرے استاد کی نشانی ہے۔ واہ ڑے مولا۔''

''چلاؤ یا نہ چلاؤ۔ یہ تمہاری ملکیت ہے۔ اب یہ تمہارا ہے۔ ذاتی ملکیت چاہے تو بیچ دو۔''

خدو کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''منہ بند کر دو اور دفع ہو جاؤ۔ جاؤ اپنے روٹ پر روپیہ کماؤ۔ مگر خبردار نشہ نہ کرنا۔ ورنہ ٹانگیں توڑ دوں گا۔''

''سیٹھ ٹوٹی ہوئی ٹانگوں میں کوچ کیسے چلاؤں گا۔''

دفتر قہقہوں سے گونج اٹھا۔

......

ڈاکٹر سرور کو چپڑاسی نے ہچکچاتے ہوئے آگاہ کیا ''ایک اندھا مریض بغیر باری کے اندر آنے کی ضد کر رہا ہے۔ اپنا نام استاد رحمان بتا رہا ہے۔''

معاً برق سی کوند گئی۔ ''جلدی اندر لاؤ۔''

چپڑاسی کا سہارا لیے ہوئے ایک بوڑھا ٹٹولتا ہوا معائینہ والے آہنی سٹول پہ آ بیٹھا' چپڑاسی باہر چلا گیا۔ نووارد کے لباس سے بدبو کے بھبھاکے اٹھ رہے تھے۔

''ڈاکٹر صاحب میں رحمان ہوں۔ استاد رحمان۔''

سرور حیران رہ گیا' پھر اٹھ کر گرمجوشی سے ملا' اور ساتھ کے کمرے میں لے آیا۔ رحمان کے بال سفید ہو چکے تھے۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ اس کے

خستہ حال چیتھڑوں سے تباہ کن بدبو اٹھ رہی تھی۔ جسے برداشت کرنا کسی ڈاکٹر ہی کی ہمت تھی۔ اتنے سالوں میں وہ مکمل طور پہ بوڑھا ہو چکا تھا۔ ''تم پہ تو تیس لاکھ کا انعام ہے' کہاں رہے؟ استاذ'' سرور خوشی سے پاگل ہو گیا اس کا تو دماغ ہی گھوم گیا تھا۔

''رحمان تم زندہ ہو۔'' سرور مارے خوشی کے رحمان سے لپٹ گیا۔

''میں بیلہ کی مدد کے لیے جا رہا تھا۔جانے کون مجھے روکنا چاہتے تھے۔ پھر فائرنگ ہوئی میں غیر معروف راستوں کی جانب سے بیلہ کے لیے کراچی کی جانب بڑھنے لگا۔ فائرنگ ہوئی پچھلے ٹائر اُڑ گئے کسی گولی نے بریک کا سسٹم اڑا دیا تھا۔ مجھے پتہ نہ چلا بلندی سے گاڑی نیچے آ رہی اور چٹان سے ٹکرا گئی۔ دماغی چوٹ سے میں اندھا ہوگیا۔ پھر جانے گرتا پڑتا کہاں نکل گیا۔ بیہوش پڑا تھا کہ چرواہے اٹھا کر لے گئے۔ پھر جانے کیا ہوا کچھ یاد نہیں۔ انہوں نے کسی کے ذریعے مجھے علاج کے لیے کراچی پہنچا دیا۔ جہاں کچھ لوگ مجھے نشہ آور دواء پلا کر بازاروں میں بٹھا دیا کرتے۔ دماغ سا۔ ساکن رہتا۔لوگ خیرات پھینکتے رہتے۔ پھر جانے کتنے سالوں بعد شام کو مجھے اٹھا کر لے جانے والی گاڑی نہ آئی۔ میں گرتا پڑتا اِدھر اُدھر نکل گیا پتہ چلا کہ یہ کراچی شہر ہے۔ چند روز وہ دوائی نہ پی تو دماغ کچھ کچھ کام کرنے لگا' آپ کا نام مشہور تھا آپ تک پہنچنا آسان تھا۔ ایک رحمدل شخص آپ تک لے آیا۔ مجھے بیلہ کے پاس فوراً بھجوا دیں' سیٹھ شمروز کے پاس بھجوا دیں۔ جلدی کریں'

کیا میری آنکھوں کا علاج ہوسکتا ہے۔"

سرور بہت مسرور تھا۔ "میرا خیال ہے کہ ہوسکتا ہے کیونکہ یہ پیدائشی اندھا پن نہیں ہے اور تمہیں خوشی ہوگی۔ خوشی سے پاگل ہو جاؤ گے کہ تم ہیرو بن چکے ہو۔"

"میں! میں! واقعی مگر وہ کیسے؟" رحمان متحیر تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا۔

"تمہیں پتہ نہیں کہ تمہاری گمشدگی کو چھ سال گزر چکے ہیں۔"

"چھ سال" رحمان تھرا سا گیا۔ "شمروز نے تمہارے نام کی مسجد بنوا دی ہے۔ رحمان مسجد جہاں طالب تمہارے لیے سپارے پڑھتے ہیں۔ ہر سال دھوم دھام سے تمہاری برسی منائی جاتی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شاہ مرید کی طرح خدا نے تمہیں ابدی زندگی دے دی۔ تمہیں کئی لوگوں نے صحرا میں دیکھے جانے کا دعویٰ بھی کیا ہے۔

تمہارے اسکول کا نام بدل کر رحمان اسکول رکھ دیا گیا ہے۔ مستونگ کی ایک سڑک کا نام بھی تمہارے نام پہ رکھ دیا گیا ہے، ہر سال اسکول میں تمہاری برسی منائی جاتی ہے۔ لوگ تقریریں کرتے ہیں۔ بچے بھی تمہارے لیے تقریریں کرتے ہیں۔ ایک بار مجھے مہمان خصوصی بنایا گیا۔ تمہارے لیے تقریر کرتے ہوئے دکھ ہو رہا تھا۔ بس رونا ہی آرہا تھا۔ ادھر کوئٹہ کراچی روٹ پر تم Legend بن چکے ہو۔ تمہاری باتیں ہوتی ہیں کہ تمہارے ساتھ خدا کی مدد ہے،

جو تمھیں بے شمار لوگ بھی نہ روک سکے۔ ڈرائیور اپنے شاگردوں سے کہتے ہیں
کہ بننا ہے تو استاد رحمان بنو۔ مسافروں کو جلدی ہو تو اصرار کرتے ہیں
ڈرائیوروں سے کہ استاد رحمان کی طرح تیز چلائیں یوں سمجھو کہ سات سو کلومیٹر
طویل کوئٹہ کراچی روڈ کے تم ہی بے تاج بادشاہ ہو۔''

رحمان خوش ہونے کی بجائے بجھ سا گیا۔ خوشی کے اضطراب اور ہیجان
سے نکل کر وہ اداس وادیوں میں نکل آیا تھا۔ جہاں مہرگڑھ کے کھنڈر تھے۔

''میری موت نے مجھے ہیرو بنا دیا' میری زندگی ہیرو کو تباہ کردے گی۔
کتنی بڑی عزت ملی ہے۔ جس کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میں ہیرو کی
موت مر چکا ہوں۔ مجھے زندہ نہیں ہونا چاہیے۔ اور خدو کا کیا بنا؟''

رحمان چہکا۔

''واہ خدو تو مردِ میدان نکلا۔ اس نے تمہارے قتل خود قبول کر لیے
تھے۔ اس نے بیلہ کے گھرانے کو سنبھالا' تم سے وفا کی اس نے حد کر دی۔ اس
نے بیلہ کی چھوٹی بہن سے شادی بھی کرلی۔ اپنے بیٹے کا نام بھی رحمان رکھا
ہے۔ دنیا ایسے ہی لوگوں کے دم سے قائم ہے۔ ہاں وہ باعزت بری ہو گیا تھا۔
کچھ موٹا بھی ہو گیا ہے۔''

رحمان نے دھماکہ خیز سوال کیا ''اور بیلہ......؟''

''استاد ساری باتیں ہوں گی تم بھوکے لگ رہے ہو۔''

''ہاں! دو روز سے کھانا نہیں کھایا۔ ویسے تو چھ سال سے بھوکا ہوں۔''

سرور نے اعلیٰ سگریٹ پیش کیا۔ پھر ذرا سی دیر میں کھانا لگ گیا۔ اشتہا انگیز خوشبو کے باوجود رحمان نے کھانے کو ہاتھ نہ لگایا۔ نہ ہی پانی پیا۔

''پہلے بیلہ کا بتائیں۔ سب سے پہلے بیلہ۔ مجھے اس کے پاس جانا ہے۔ کھانے کے بغیر تو میں کئی دن اور بھی زندہ رہ سکتا ہوں۔''

ڈاکٹر تو ٹانگ کاٹنے اور آپریشن کی خبریں بھی لطیفوں کی طرح سنایا کرتے ہیں۔ سرور ہچکچاتا رہا۔ مگر اب فرار کے راستے مسدود ہوچکے تھے۔ سرور تذبذب کے عالم میں تھا۔ چہرہ متغیرہ ہوگیا ایک رنگ آتا ایک رنگ جاتا۔ مگر بولے بنا چارہ نہ تھا۔

سرور نے بے جان آواز میں موت کا اعلان کیا۔

''بیلہ نے پھر مایوس ہوکر شادی کرلی۔ اس کا بھی ایک بیٹا ہے۔''

اچانک امریکن بمبار طیارے رحمان کے چہرے پہ ٹوٹ پڑے' نیپام بم گرنے لگے' اس کا چہرہ قلعہ جنگی بن گیا' تورہ بورا بن گیا وہ Twin Towers کی طرح مسمار ہوگیا۔

کچھ دیر رحمان من ہی من میں کانپتا رہا۔

اس نے ایک اور سگریٹ طلب کیا۔

اور دھواں نگلتا رہا' دل میں جلن انڈیلتا چلا گیا۔

رحمان کی ہیجانی کیفیت اور بعد کے ڈپریشن سے سرور خود بھی نروس ہوچکا تھا۔ ''تم ذرا اطمینان سے کھانا کھاؤ آج OPD کا رش ہے' کچھ دیر بعد

باتیں کریں گے۔'' سرور اس ایڑیاں رگڑتے انسان سے کچھ دیر کے لیے دور ہو جانا چاہتا تھا۔ وہ خود بھی نروس ہو چکا تھا۔

سرور ابھی تک مریضوں کے ہجوم میں ہی گھرا بیٹھا تھا کہ ایک خوش پوش جوان اندر داخل ہوا۔

''ڈاکٹر صاحب' معذرت چاہتا ہوں۔ آپ کو ڈسٹرب کیا' ابھی ہسپتال کے گیٹ پہ ایک درویش مجھ سے ٹکرایا' اندھا تھا' اس نے قسمیں دے دے کر ایک پیغام مجھ سے لکھوایا' اور التجائیں کیں کہ میں یہ کاغذ آپ کو ذاتی طور پر پیش کروں۔''

سرور نے بیتابی سے کاغذ اچک لیا۔ صرف اتنا ہی تحریر تھا۔

''میری موت نے مجھے ہیرو بنا دیا ہے۔ مجھے زندہ مت کرنا۔ میں دوسری بار مرنا نہیں چاہتا۔ عزت کی موت بہتر ہے، تمہیں میری دوستی کی قسم مجھے ایک باعزت موت دینا۔''

سرور ساتھ کے کمرے میں لپکا۔ کمرہ خالی تھا۔ کھانا جوں کا توں پڑا تھا۔

وہ ڈگ بھرتا ہوا ہسپتال کے گیٹ پر پہنچا۔

باہر انسانوں کا ہجوم تھا' انسان ہی انسان چہرے ہی چہرے' آنکھیں ہی آنکھیں۔ اس اژدھام میں رحمان جانے کہاں مدفون ہوگیا تھا۔

بوجھل قدموں سے چلتا ہوا سرور واپس آیا۔

مریضوں کے ستے ہوئے چہرے، پریشان حال لواحقین جن کے محبت مریضوں پہ نثار ہو رہی تھی وہ روپیہ دے کر اپنا خون دے کر انہیں تندرستی دلا دینا چاہتے تھے۔ سرور کو ان مریضوں کے لیے زبردستی مسکراہٹ لانا پڑتی تھی۔ جانے پطرس رسول نے یسوع مسیح کو پہچاننے سے کیسے انکار کیا ہوگا۔ کیسی کیسی صلیبوں پہ لٹکا ہوگا۔ اور مرغ کی تین بار بانگ کے بعد آنسو بہاتا رہا۔ سرور کو بھی ایک سچائی سے انکار کرنا تھا۔

''جو نمبر میں نے کہے تھے وہ مت ملانا۔'' اس نے اپنے پی اے کو بے دلی سے کہا اور دوبارہ ٹوٹے پھوٹے انسانوں کے دکھ درد سننے لگا۔

بزر بجا۔ سرور نے بے دلی سے فون اٹھایا۔پی اے نے بتایا کہ کوئٹہ سے سیٹھ شمروز کا فون ہے۔ سلام دعا کے بعد شمروز نے دریافت کیا۔ ''مینجر نے بتایا کہ آدھ گھنٹہ پہلے تمہارا فون آیا تھا' میں کسی کام سے نکلا تھا' کہو کیا بات ہے؟''

رحمان کی دوسری موت یا ابدی زندگی سرور کے بس میں تھی۔ تیس لاکھ سامنے پڑے تھے۔ اس کا دل ڈگمگا رہا تھا۔ ہمت سے کام لے کر سرور نے کانپتے ہاتھوں سے سرجیکل نائف پکڑ لیا' اور اپنے ہی دل کو دو حصوں میں کاٹ ڈالا۔

''بس یونہی آپ یاد آرہے تھے۔ آپ کی خیریت دریافت کرنا چاہتا تھا۔''

''شکر ہے اللہ کا! تم فون کرتے رہا کرو' تم رحمان کے دوست ہو' تم سے باتیں کرنا بہت اچھا لگتا ہے۔ اگلے ماہ رحمان کی برسی ہے' برسی پر ضرور آنا۔''

I have know Agha Gul as my sibling when he was not yet a famous writer. He used to be physically weak and short but nevertheless ever read to compete with me, be it in climbing mountains, motorcycling, cracking jokes or showing worldly wisdom. He "could do" what I did", he was ready to fight anytime, even with me. As his elder brother, today I find all his childhood traits reflected in his short stories and novels. Not only that but he also reflects minor incidents and occasions in his writings with wit and humor which is what makes his plots and themes so very readable. One can associate oneself with his characters and his plots.

Age and a broad based education, achieved due to the encouragement of our father, who pushed us to read a lot, has today turned him into a critical observer and a witty story teller. He has also mellowed down, matured and become an excellent companion and a good company. His interest in different cultures and understanding of the traditions has aided him in his writings. The cutting edge of his writing lies in his critical observations, in his wit and the humor he sees in simple things.

He boldly uses expressions and languages picked up from regional settings, especially Brahvi. His writings force one to raise one's eyebrows, and yet re read his books from time to time. Indeed Agha Gul displays the potential to join the exalted names of great Urdu Writers.

Reflecting on his writings, "Bella" is an Epic Tragedy, in regionalism. Agha Gul is essentially an impressionist. His own connotations of life guide his fictions. Qura-tul-Ain Hyder had appreciated his humanitarianism in his writings. "Babu" is a PICARESQUE NOVEL. The trend of the Russian Novelist Nikolay Geogol is reflected in his Epic Novel "Dashte-e-Wafa", which is based on the insurgency of the 1970S. He has a universal outlook, but in his fiction he focuses on Balochistan. He skillfully captures the crux of the History of Balochistan and its socio economic dynamics.

He has studied in Germany and Thailand, has visited France, Denmark, Turkey and South Africa yet remains enchanted with the Baloch State of Mir Nasir Khan Noori when Balochistan was a far larger and more realistic region, in his opinion. His romance and passion for the Brahvi Tribes is pervasive of local beauty and traditions.

Indeed, Agha Gul has introduced his own unique and distinctive style in his fiction writings. I wish him all the success in his passion for writings.

Brig® Agha Ahmad Gul,
Vice Chancellor,
University of Balochistan.